الرسالہ

Al-Risāla

July 2000 • No. 284 • Rs. 10

نادان ہونا قابلِ معافی ہے مگر یہ قابلِ معافی نہیں کہ کوئی شخص اپنی نادانی کو دوسروں کے لئے ضرر رساں بنادے۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
مطالعۂ سیرت	60.00
اسباق تاریخ	85.00
تعمیر حیات	60.00
تعمیر انسانیت	50.00
سفرنامہ غیر ملکی اسفار، جلد دوم	125.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	40.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراطِ مستقیم	40.00
خاتونِ اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	50.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیۃ	40.00
کاروانِ ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	80.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00

عظمتِ مومن	7.00
اسلام: ایک عظیم جدوجہد	5.00
تاریخ دعوت حق	5.00
مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوالِ حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیاتِ اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	10.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نشری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	50.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازدواج	7.00
ہندستانی مسلمان	50.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	5.00
علما اور دور جدید	10.00
سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
مذکرہ: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	10.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
منزل کی طرف	5.00
اسفار ہند	125.00
ڈائری ۹۰-۱۹۸۹	100.00
قال اللہ و قال الرسول	70.00

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel: 462 5454, 461 1128 Fax: 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: Islamic Vision
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-Risala Forum International
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Sanjyasnain Khan on behalf of the Islamic Centre, New Delhi, Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana road, Khureji Khas, Delhi- 110 051

الرسالہ، جولائی 2000

فہرست

آخرت کی یاد ---------- 4
اعتراف عجز ---------- 5
آواز بلند کرنا ---------- 6
پانچ اصول ---------- 7
غیر ضروری ٹکراؤ ---------- 8
مخلص غیر مخلص ---------- 9
نیوٹن اور مذہب ---------- 10
پرامن زندگی کا راز ---------- 11
فطرت کا قانون ---------- 16
قاتل انسانیت ---------- 20
فہم دین: ایک اصول ---------- 22
امتحان کا پرچہ ---------- 30
مذہب اور سائنس ---------- 31
اتحاد کا فارمولا ---------- 39
سوال و جواب ---------- 41
خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۴ ---------- 48
ایجنسی الرسالہ ---------- 50

آخرت کی یاد

موجودہ دنیا اس طرح بنائی گئی ہے کہ وہ آدمی کے لئے آخرت کی پیشگی یاد دہانی بنے۔ دنیا کا ہر نقصان اس لئے ہے کہ آدمی آخرت کو یاد کرے اور یہ کہے کہ خدایا تو آخرت میں میرے نقصان کی تلافی فرما۔ دنیا کا آرام اس لئے ہے کہ آدمی آخرت کو یاد کر کے یہ کہہ سکے کہ خدایا، دنیا کا آرام وقتی ہے، تو مجھے آخرت کے ابدی آرام سے سرفراز فرما۔ دنیا اس لئے نہیں ہے کہ آدمی اس کو اپنا سب کچھ سمجھ لے۔ بلکہ دنیا اس لئے ہے کہ وہ آدمی کے لئے ایک ربانی تجربہ گاہ بن جائے۔ وہ تخلیق کے ہر مشاہدہ میں خالق کا جلوہ دیکھنے لگے۔ انسانوں کے ساتھ ہر معاملہ اس کے سینہ میں داخل ہو کر روحانی تجربہ میں ڈھل جائے۔ دنیا اس کے لئے ایک ایسی گزرگاہ بن جائے جہاں اس کا ہر قدم اس کو آخرت کی منزل کی طرف لے جا رہا ہو۔

انسان اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں بظاہر آخرت کا کوئی نشان نہیں۔ مگر انسان کو فہم و بصیرت کی طاقت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ محسوس دنیا میں غیر محسوس آخرت کا مشاہدہ کرے۔ دنیا کے تجربات کو وہ آخرت کے تجربات میں تبدیل کرتا رہے۔ دنیا کی تکلیف میں وہ جہنم کا ادراک کرے۔ دنیا کی راحت اس کے لئے جنت کا ابتدائی تعارف بن جائے۔

آخرت کی کامیابی کے لئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی کلمہ کو صحت تلفظ کے ساتھ دہرا دے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ عقیدہ اس کے لئے ذاتی دریافت بن جائے۔ وہ اس کے شعور کی گہرائیوں میں تیر جائے۔ وہ اس کے لئے مشاہدہ اور تجربہ کا درجہ حاصل کر لے۔

اس دنیا میں آدمی کو نہ دکھائی دینے والی حقیقت کو دیکھنا ہے۔ اس کو نہ سنائی دینے والی آوازوں کو سننا ہے۔ اندھیروں میں چھپی ہوئی حقیقت کو غیر مشتبہ یقین کی صورت میں پالینا ہے۔ ایسا ہی انسان وہ انسان ہے جس نے خدا کو پایا اور یہی وہ انسان ہے جس کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

اعتراف عجز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں ایک شخص پیدا ہوا۔ اس کا نام عبداللہ بن جدعان تھا۔ وہ نہایت شریف اور سخی آدمی تھا۔ کثرت سے لوگوں کو کھلاتا تھا اور لوگوں کی مدد کرتا تھا۔

عبداللہ بن جدعان کے بارہ میں ایک روایت صحیح مسلم میں آئی ہے جو کہ حسب ذیل ہے:

عن عائشة قالت يا رسول الله ان ابن جدعان كان يطعم الطعام ويقرى الضيف، فهل ينفعه ذالك يوم القيامة. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا، انه لم يقل يوماً رب اغفرلى خطيئتى يوم الدين.

حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول، عبداللہ بن جدعان لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا اور مہمانوں کی عزت کرتا تھا۔ کیا اس کا یہ عمل قیامت کے دن اس کو فائدہ پہنچائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، کیوں کہ اس نے کسی دن یہ نہ کہا کہ اے میرے رب، جزا کے دن میرے گناہ کو بخش دے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ کیا ہے۔ وہ اعتراف ہے۔ بندہ جب اپنی بندگی اور خدا کی خدائی کی پہچان حاصل کرتا ہے تو اس کے اندر شدید طور پر اپنی عاجزی کا احساس طاری ہوتا ہے۔ خدا کی عظمت اور کمال کے سامنے اس کو اپنا وجود سراپا تقصیر نظر آنے لگتا ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے آگے گر پڑے۔ وہ خدا سے رحمت اور بخشش کی التجا کرنے لگے۔

"خدایا مجھے بخش دے" عجز کا کلمہ ہے۔ اور عجز کا کلمہ ہی جنت کی آخری قیمت ہے۔ جس آدمی کے پاس نہ عمل ہو اور نہ اعتراف بے عملی تو اس کو جنت آخر کس بنیاد پر دی جائے گی۔

آواز بلند کرنا

اکبر الٰہ آبادی (۱۹۲۱-۱۸۴۶) اردو زبان کے مشہور شاعر ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کے انداز میں اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

ظلم سے اکبر بتوں کے، چپ نہ رہنا چاہئے اور کچھ نہ بن پڑے تو شعر کہنا چاہئے

یہ شعر ان انسانوں پر صادق آتا ہے جن کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالف حالات کو بدل سکیں، تو ایسے لوگ لفظی چیخ پکار میں مشغول ہو جاتے ہیں جس کو وہ بطور خود "ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا" کہتے ہیں۔

اس قسم کا لفظی شور و غل یقینی طور پر بے معنی ہے۔ وہ سراسر بے فائدہ ہے۔ دانش مند انسان وہ ہے جو بے فائدہ کاموں سے بچنے والا ہو۔

ناموافق حالات میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ تعمیر و استحکام کے ذریعہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنایا جائے کہ مخالفوں کے مخالفانہ منصوبے بے اثر ہو کر رہ جائیں۔ ایسی حالت میں جب بے نتیجہ شور و غل کو کام سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد ایسا ہوگا کہ لوگوں کی توجہ اصل کام سے ہٹ جائے گی۔ وہ سمجھیں گے کہ حالات کے مقابلہ میں ہم کو جو کچھ کرنا چاہئے وہ ہم کر رہے ہیں۔ یہ کوتاہ فہمی ان کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن جائے گی۔

عمل وہی ہے جو نتیجہ خیز ہو۔ جس عمل کا کوئی حقیقی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو وہ کوئی عمل بھی نہیں۔ ایسی حالت میں "ظلم کے خلاف چیخ و پکار" مضر بھی ہے اور بے فائدہ بھی۔ وہ ایک نقصان کے بعد اپنے آپ کو دوسرے نقصان میں ڈالنا ہے۔

اس دنیا میں اس سے زیادہ تباہ کن کوئی چیز نہیں کہ نہ کرنے کو، کرنا سمجھ لیا جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن میں لغو سے پرہیز کرنا کہا گیا ہے۔

پانچ اصول

اصول فقہ کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ بیشتر قاعدے پانچ بنیادی اصولوں میں منحصر ہیں(ان اعظم القواعد الفقهية تنحصر فی خمس)ان پانچ سے سیکڑوں ضابطے نکلتے ہیں جو بیشتر امور کو اپنے دائرہ میں لے لیتے ہیں۔ یہ پانچ اصول(القواعد الخمس الذهبية)یہ ہیں:

۱۔الامور بمقاصدها	معاملات کا انحصار نیت اور قصد پر ہے۔
۲۔اليقين لا يزال بالشك	یقین کبھی شک سے زائل نہیں ہوتا۔
۳۔الضرر يزال	نقصان کو دور کیا جائے گا۔
۴۔ المشقة تجلب التيسير	مشقت آسانی لے آتی ہے۔
۵۔ العادة محكمة	عرف اور رواج قابل لحاظ ہیں۔

آدمی جب بھی کوئی کام کرے یا کوئی قدم اٹھائے تو سب سے پہلے اس کی نیت دیکھی جائے گی۔ اگر اس کی نیت درست ہے تو اس کا اقدام درست ہے اور اگر نیت درست نہیں تو اس کا اقدام بھی درست نہیں۔

ایک شخص کے عام حالات اگر اس یقین کی طرف لے جارہے ہوں کہ وہ صحیح آدمی ہے تو محض ایک شک کی بنیاد پر اس کو غلط آدمی نہیں قرار دیا جاسکتا۔

اگر ایک شخص تکلیف میں مبتلا ہے یا کوئی نقصان کی صورت پیدا ہو گئی ہے تو ہر حال میں اس کا ازالہ کیا جائے گا، خواہ وہ کسی کا بھی معاملہ ہو۔

بعض فیصلے بظاہر کسی شخص یا گروہ کو مشقت میں ڈالنے والے ہوتے ہیں، لیکن اگر فیصلہ صحیح ہے تو باعتبار انجام اس سے آسانی ظاہر ہوگی۔

جو چیزیں لوگوں کے درمیان پسندیدہ رواج کی حیثیت حاصل کرلیں، ان کی حیثیت بھی ایک قانون کی ہے۔ امکانی حد تک ان پر عمل کیا جائے گا۔

غیر ضروری ٹکراؤ

موجودہ زمانہ میں مذہب اور سائنس کے درمیان جو نظریاتی ٹکراؤ ہوا وہ اکثر غیر ضروری تھا۔ جن چیزوں کو مذہب کے خلاف فرض کر لیا گیا ان کا تعلق نہ مذہب کی مخالفت سے تھا اور نہ موافقت سے۔ اس کی ایک مثال ارتقاء کا نظریہ ہے۔

مگر خالص علمی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ نظریۂ ارتقاء بالفرض صحیح ہو، تب بھی مذہب کے ساتھ اس کا کوئی واقعی ٹکراؤ نہیں ہے۔ کیوں کہ نظریۂ ارتقاء جس چیز سے بحث کرتا ہے وہ خدا کا وجود یا عدم وجود نہیں ہے بلکہ صرف یہ کہ ذی حیات اشیاء کا نشو وارتقاء کیسے ہوا۔ وہ خالق کے مسئلہ کا جواب نہیں بلکہ طریق تخلیق کے مسئلہ کا جواب ہے، خواہ خالق کوئی بھی ہو۔ چنانچہ مسلم محققین جو عیسائی علماء کی طرح غلط عقائد کی پیچیدگی میں مبتلا نہیں تھے، انھوں نے بروقت اس نکتہ کو محسوس کیا اور اس کی صراحت کی۔ مثال کے طور پر طرابلس کے شیخ حسین الجسر (۱۹۰۹۔۱۸۴۵) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں جبکہ عیسائی علماء نظریہ ارتقاء کو مذہب دشمن قرار دے کر سائنس دانوں سے لڑ رہے تھے، شیخ جسر نے اپنی کتاب "الرسالة الحمیدیة فی حقیقة الدیانة الاسلامیة" میں نشاندہی کی کہ نظریہ ارتقاء کا مذہب سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ کیونکہ بالفرض وہ صحیح ہو تب بھی وہ صرف خدا کے طریق تخلیق پر روشنی ڈالتا ہے، نہ کہ خدا کے وجود کی نفی کرتا ہے، جیسا کہ خود ڈارون نے اس کو یہی حیثیت دی ہے۔ ڈارون کے نزدیک ارتقاء سے خدا کے وجود کی نفی نہیں ہوتی بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالق (Creator) کا طریق تخلیق (process of creation) کیا تھا۔

اہل مذہب کو اس معاملہ میں فتوی اور مناظرہ کا انداز چھوڑ کر یہ کہنا چاہئے تھا کہ ارتقاء کے حق میں سائنٹفک دلائل پیش کرو۔ اس کے بعد انھیں معلوم ہوتا کہ اس نظریہ کے حق میں کوئی حقیقی سائنٹفک دلیل موجود ہی نہیں۔

مخلص، غیر مخلص

دو لکڑی بظاہر ایک سائز کی ہیں۔ دونوں پر ایک ہی قسم کا رنگ لگا ہوا ہے۔ مگر ان میں سے ایک اندر سے دیمک زدہ ہے، اور دوسری پوری طرح پختہ اور سالم ہے۔ اوپر سے دیکھنے میں دونوں بظاہر یکساں معلوم ہوں گی۔ لیکن استعمال کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہوں گی۔ دیمک زدہ لکڑی پر جب کوئی بوجھ رکھا جائے گا تو وہ فوراً ہی ٹوٹ جائے گی۔ اس کے برعکس پختہ لکڑی ہر بوجھ اٹھائے گی، وہ ہر استعمال میں مضبوط اور قابل اعتماد ثابت ہوگی۔

اس مثال سے مخلص انسان اور غیر مخلص انسان کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ مخلص انسان ہر آزمائش میں پختہ لکڑی ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غیر مخلص انسان پر جب کسی آزمائش کا وقت آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دیمک زدہ لکڑی تھا۔ وہ باہر سے کچھ تھا اور اندر سے کچھ۔

مخلص انسان جو لفظ بولتا ہے وہ عمل کے وقت ٹھیک ویسا ہی کردار ادا کرتا ہے۔ وہ جب کسی سے وعدہ کرتا ہے تو ٹھیک اپنے وعدہ کے مطابق اس کی تعمیل کرتا ہے۔ اس کو جب کوئی امانت سونپی جاتی ہے تو تجربہ کے وقت وہ پوری طرح امین ثابت ہوتا ہے۔ اس کے اوپر جب کسی کا حق آتا ہے تو وہ کسی عذر کے بغیر صاحب حق کو اس کا حق ادا کر دیتا ہے۔ خواہش اور انانیت اس کو سرکش نہیں بناتی۔ دنیوی مفادات اس کو حق کے راستہ سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

غیر مخلص انسان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ کو عمل کے وقت یاد نہیں رکھتا۔ وہ زور و شور کے ساتھ لوگوں سے وعدہ کرتا ہے مگر وہ اپنے وعدہ کو کبھی پورا نہیں کرتا۔ اس کو جب کسی چیز کا امانت دار بنایا جائے تو وہ پہلے ہی موقع پر خیانت پر اتر آتا ہے۔

مخلص اور غیر مخلص کا یہی فرق کسی انسان کے مستقبل کا فیصلہ کرتا ہے۔ موجودہ دنیا کی تمام حقیقی کامیابیاں صرف اس انسان کے لئے ہیں جو فی الواقع ایک مخلص انسان ہو۔ یہی وہ انسان ہے جو موت کے بعد کی زندگی میں ابدی سعادتوں سے نوازا جائے گا۔

نیوٹن اور مذہب

مشہور سائنس داں نیوٹن نے مسیحی مذہب کے بارہ میں دو کتابیں چھوڑیں جو اس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔ سترہویں صدی کے آخر میں اس نے جان لاک کو ایک مسودہ بھیجا جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ بائبل میں تثلیث کی جو آیتیں ہیں وہ اصل متن میں شامل نہ تھیں۔ وہ بعد کا اضافہ ہیں۔

In the early 1690s he had sent Locke a copy of a manuscript attempting to prove that Trinitarian passages in the Bible were latter-day corruptions of the original text. (13/20)

نیوٹن ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم ٹرینیٹی کالج (کیمبرج) میں ہوئی۔ حتی کہ وہ ٹرینٹی کالج کے اسٹاف میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز تھا۔ مگر اس کا عقلی غور و فکر کا مزاج روایتی مسیحیت سے ٹکرا گیا۔ وہ ٹرینیٹی (تثلیث) کا مخالف ہو گیا جس کے اوپر مسیحی مذہب کی بنیاد ہے۔

مسیحیت کے عقیدۂ تثلیث کے مطابق باپ، بیٹا، روح القدس، تینوں بالکل برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں۔ تینوں یکساں طور پر مقدس ہیں، اور تینوں ناقابل تفریق تثلیث کے تین ارکان ہیں۔ مگر نیوٹن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ بیٹا، باپ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بیٹا مخلوق ہے اور باپ خالق۔ بیٹا پہلے دنیا میں غیر موجود تھا، پھر وہ وجود میں آیا۔ لیکن باپ ہمیشہ سے ہے اور وہ ہمیشہ رہے گا۔ جس ہستی کو ہمیشگی حاصل ہے، اور جس ہستی کو ہمیشگی حاصل نہیں، دونوں ہستیاں کس طرح برابر ہو سکتی ہیں۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ اسلام کے سوا جو مذاہب ہیں، وہ کتنی کمزور بنیاد پر قائم ہیں۔ دوسرے مذاہب کی اس کمزوری نے اسلام کو یہ حیثیت دے دی ہے کہ وہ اپنے آپ پھیلے، وہ اپنے آپ لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالے۔

پرامن زندگی کا راز

نفسیات کے موضوع پر ایک کتاب چھپی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ اس دنیا میں پرسکون زندگی گزارنے کا راز کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار یارک شائر (برطانیہ) سے 1970ء میں چھپی ہے۔ ۲۷۰ صفحہ کی اس کتاب کا نام اور مصنف کا نام یہ ہے:

Thomas A Harris, MD, I AM OK- YOU ARE OK

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ایک آدمی جب سماج میں زندگی گزارتا ہے تو دوسروں کے ساتھ اس کے تعلقات کی چار حالتیں ہو سکتی ہیں۔ انہیں کے الفاظ میں وہ چار حالتیں یہ ہیں:

1. I AM NOT OK — YOU ARE OK
2. I AM NOT OK — YOU ARE NOT OK
3. I AM OK — YOU ARE NOT OK
4. I AM OK — YOU ARE OK

یعنی پہلی حالت یہ ہے کہ میں ٹھیک نہیں اور تم ٹھیک ہو دوسری حالت یہ کہ میں بھی ٹھیک نہیں اور تم بھی ٹھیک نہیں۔ تیسری حالت یہ ہے کہ میں ٹھیک ہوں اور تم ٹھیک نہیں اور چوتھی حالت یہ ہے کہ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک۔ (p. 42)

کتاب کے مصنف کے نزدیک صرف آخری اور چوتھی حالت ہی درست حالت ہے۔ ابتدائی تین حالتیں درست نہیں۔ ابتدائی تین حالتوں میں آدمی کو ذہنی سکون (peace of mind) نہیں ہو سکتا، جب کہ آخری حالت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ آدمی کو پوری طرح ذہنی سکون حاصل ہو جائے گا۔

مگر پرسکون زندگی کا یہ فارمولا کوئی درست فارمولا نہیں۔ یہ اس نظریہ پر مبنی ہے جس کو فلسفہ میں نظریہ افادیت (utilitarianism) کہا جاتا ہے۔ نظریہ افادیت کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ ـــــ یہ اصول کہ کسی چیز کی قدر و قیمت تمام تر اس کی عملی افادیت سے متعین ہوتی ہے:

The doctrine that the worth or value of anything is determined solely by its utility. (Webster's Dictionary)

نظریۂ افادیت کو اگر درست مان لیا جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ حیوان کے اندر جبلی طور پر خیر و شر کے درمیان کوئی تمیز نہیں۔ حیوان اس فرق کو نہیں جانتا کہ اپنے مالک کے کھیت میں چارہ کھانا صحیح ہے اور غیر کے کھیت میں گھس کر اس کی فصل کھانا غلط۔ مگر انسان کی فطرت میں حق اور باطل کا فرق رکھا گیا ہے۔ وہ فطری طور پر ایک موقف کو درست اور دوسرے موقف کو غلط سمجھتا ہے۔

ایسی حالت میں انسان جیسی مخلوق کے لئے یہ نظریہ درست نہیں ہو سکتا کہ وہ سیاہ اور سفید دونوں کو ایک کہے۔ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک، جیسا نظریہ کوئی شخص مصنوعی طور پر تو اختیار کر سکتا ہے مگر حقیقی طور پر نہیں۔ ایک آدمی اگر دیانتدار (honest) ہے تو وہ اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ ایک حالت کو ٹھیک سمجھے اور اس کے برعکس حالت کے بارے میں اس کی رائے یہ ہو کہ وہ ٹھیک نہیں۔ میں بھی ٹھیک اور تم بھی ٹھیک کا نظریہ ایک تاجر کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے مگر ایک با اصول انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس قسم کے نظریہ کو اپنے دماغ میں جگہ دے۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں جہاں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہاں ٹکراؤ سے کیسے بچا جائے اور پر سکون زندگی کیسے حاصل کی جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا درست فارمولا یہ ہے ــــ میں اپنے کو حق پر سمجھتا ہوں اور تم کو ناحق پر، مگر میں تمہارا مکمل احترام کروں گا۔ اس فارمولے میں پوری طرح پر امن زندگی حاصل ہو جاتی ہے بغیر اس کے کہ کوئی فطری حقیقت مجروح ہوئی ہو۔

انسان کو مکمل انسانی زندگی گذارنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یقین (conviction) ہے اور اس یقین کے بغیر ایک انسان کی مثال اس درخت کی سی ہے جو اپنی جڑ سے اکھڑ گیا ہو۔ اور اس یقین کو حاصل کرنے کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی اس احساس پر کھڑا

ہوا ہو کہ میں حق پر ہوں، میں نے سچائی کو پالیا ہے۔ یہی یقین اعلیٰ انسانیت کا سرچشمہ ہے اور "میں بھی ٹھیک تم بھی ٹھیک" عین اسی احساس سے انسان کو محروم کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو "میں بھی ٹھیک، تم بھی ٹھیک" کا نظریہ انسان کے لئے ذہنی موت کے ہم معنی ہے۔

اپنے آپ کو حق پر سمجھنا، یا یہ سمجھنا کہ میں نے سچائی کو پالیا ہے کسی بھی درجہ میں دوسروں کے خلاف نفرت یا حقارت کا سبب نہیں۔ بلکہ برعکس طور پر وہ محبت انسانی کا ذریعہ ہے۔ اس معاملہ میں نفسیاتی حقیقت یہ ہے کہ کسی آدمی کے لئے سچائی کی دریافت عین اسی وقت خود اپنے لئے فروتنی (modesty) کی دریافت ہوتی ہے۔ سچائی صرف ایک ایسی چیز ہو سکتی ہے جو آدمی سے بلند تر ہو۔ جو چیز آدمی سے بلند نہ ہو وہ سچائی بھی نہیں۔ ایسی حالت میں جو آدمی حقیقی طور پر سچائی کو دریافت کرے اس نے گویا ایک ایسی عظمت کو دریافت کیا جس کے مقابلہ میں وہ خود غیر عظیم تھا۔ سچائی نہ آدمی کے برابر ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کم۔ سچائی لازمی طور پر آدمی سے عظیم تر ہو گی۔

ایسی حالت میں سچائی کی دریافت کا سب سے بڑا معیار (criterion) صرف ایک ہے اور وہ فروتنی ہے۔ جو آدمی یہ دعویٰ کرے کہ اس نے سچائی کو دریافت کیا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے اندر گھمنڈ یا برتری کا احساس ہو تو یقینی طور پر وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے جس چیز کو پایا ہے وہ خود اس کی اپنی ذات ہے نہ کہ برتر سچائی۔

انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سچائی کی تلاش کرنے والا ایک حیوان ہے:

Man is a truth-seeking animal

اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذات میں ایک نامکمل مخلوق ہے۔ انسان کی فطرت ہر لمحہ اس کو کسی چیز کی دریافت کرنے پر اکساتی رہتی ہے جو اس سے برتر ہو، جس کے ذریعہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کر سکے۔ یہ کہنا کہ انسان متلاشیٔ حق ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ انسان اپنے سے برتر ایک ایسی چیز تلاش کر رہا ہے جس کے مقابلہ میں وہ اپنی حیثیت

واقعی کا تعین کر سکے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ سچائی کو پانا دوسرے لفظوں میں گویا اپنی فروتنی (modesty) کو پانا ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کبر (arrogance) تمام برے جذبات کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں تواضع ہر قسم کی اعلیٰ کیفیات کا سرچشمہ ہے۔ ایسی حالت میں جب ایک آدمی سچائی کو دریافت کرتا ہے تو ایک طرف وہ اپنی ذات کے لئے یقین کو دریافت کرتا ہے اور دوسروں کی نسبت سے وہ ایک ایسی چیز دریافت کرتا ہے جس کی بنا پر وہ ان کے حق میں شفقت اور خیر خواہی کا پیکر بن جاتا ہے۔ اس کے دل میں دوسروں کے لئے احترام کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔

پر امن سماجی زندگی بجائے خود ایک ضروری چیز ہے مگر پر امن سماجی زندگی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ چیزوں کے درمیان فرق کو جانتے ہوئے بھی پر امن زندگی کا حصول ممکن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پر امن زندگی کا تعلق پختگی (maturity) سے ہے نہ کہ "میں بھی ٹھیک، تم بھی ٹھیک" جیسے مصنوعی فارمولے سے۔

ہر آدمی اپنی ماں سے محبت کرتا ہے۔ ماں سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ مگر اپنی ماں سے محبت کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی دوسرے کی ماں سے نفرت کرے۔ اپنی ماں سے گہری محبت کرتے ہوئے بھی آدمی دوسرے کی ماں کا مکمل احترام کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس نے دوسرے کی ماں کو بھی اپنی ماں کے طور پر تسلیم کیا ہو۔ انسان کے اندر فطری طور پر اتنی زیادہ وسعت ہے کہ وہ بظاہر مختلف چیزوں کو بیک وقت اپنے سینہ میں جگہ دے سکے۔ اسی بات کو ایک مغربی مصنف نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

I am large enough to contain all these contradictions.

سماجی ہم آہنگی کے معاملہ میں اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اختلاف (difference) کو کیسے ختم کیا جائے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اختلاف کے ہوتے ہوئے کس طرح سماجی ہم آہنگی کے

مقصد کو حاصل کیا جائے۔ کیوں کہ اختلاف اور فرق خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اختلاف اور فرق کو ختم کرنا اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔

ایسی حالت میں سماجی ہم آہنگی کا درست فارمولا باہمی اعتراف (mutual recognition) نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) ہے۔ اس معاملہ میں اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اس تعمیری شعور کو بیدار کیا جائے کہ وہ اختلاف اور فرق کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے زندگی گزار سکیں۔

دنیا میں فرق یا اختلاف کا ہونا کوئی برائی (evil) نہیں۔ بلکہ وہ ایک خوبی ہے جو انسانی ترقی کا زینہ ہے۔ فرق و اختلاف والے ماحول ہی میں لوگ اس اعلیٰ انسانی صفت کی تربیت پاتے ہیں جس کو وسعت قلب اور فراخ حوصلگی کہا جاتا ہے اور جو ہر بڑی کامیابی کی لازمی شرط ہے۔

فرق و اختلاف کے ماحول ہی میں فکری چیلنج ظہور میں آتے ہیں جو انسان کے لئے ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہیں۔ فرق و اختلاف ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسانی ترقی کا سفر محدود نہ ہو کر وسیع الاطراف ہو جائے، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ "میں بھی ٹھیک تم بھی ٹھیک" کا طریقہ کچھ پروفیشنل قسم کے لوگوں کے لئے محدود طور پر مفید ہو سکتا ہے، مگر وہ عام انسانیت کے لئے وسیع تر معنوں میں مفید نہیں۔

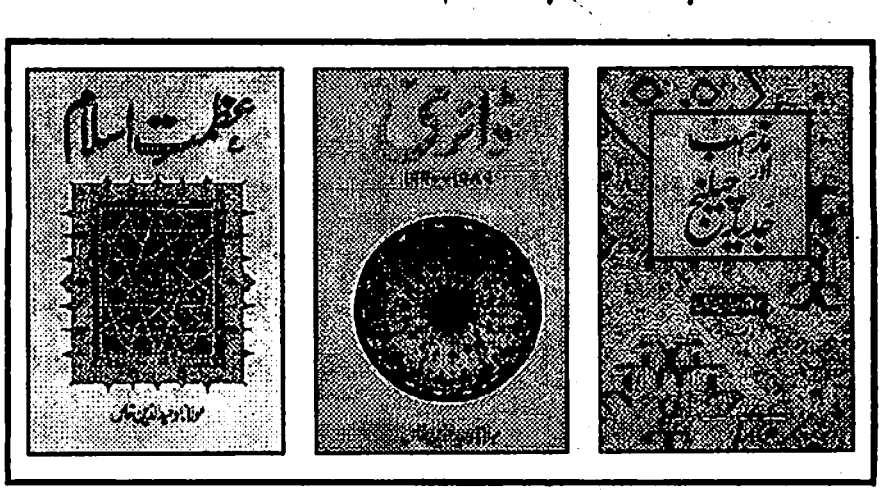

فطرت کا قانون

قدیم رومن امپائر کو بننے میں ۷۰۰ سال لگ گئے تھے۔ اسلام نے ۱۰۰ سال سے بھی کم عرصہ میں اس سے بھی زیادہ بڑا امپائر قائم کر لیا جس کی حدود ایشیا اور افریقہ سے لے کر یورپ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہندستان کے ایک مشہور ہندو اسکالر ایم این رائے (M. N. Roy) نے اپنی کتاب اسلام کا تاریخی رول (The Historical Role of Islam) میں اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ اسلام کی تیز رفتار توسیع تمام معجزوں سے زیادہ بڑا معجزہ تھا۔

The expansion of Islam is the most miraculous of all miracles (p. 4)

اسلام کی یہ توسیع سادہ طور پر صرف مذہبی یا سیاسی معنوں میں نہ تھی۔ اسلام کی یہ توسیع در حقیقت ایک عظیم انسانی انقلاب تھا جس نے تاریخ میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جن کا اس سے پہلے مشاہدہ نہیں کیا گیا تھا۔ مورخین نے اس حقیقت کا اعتراف کھلے لفظوں میں کیا ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مورخ ہنری پرین (Henri Pirenne) نے لکھا ہے کہ اسلام نے کرۂ ارض کی صورت بدل دی۔ تاریخ کا روایتی ڈھانچہ اکھاڑ کر پھینک دیا گیا:

Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown.

اسی طرح ایک امریکی انسائیکلوپیڈیا میں اسلام کے اس غیر معمولی رول کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history.

اسلام نے پوری انسانی دنیا میں جو انقلابی تبدیلی پیدا کی اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس کے علمی پہلو کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب "اسلام دور جدید کا خالق" میں کیا ہے۔ یہاں میں اس پہلو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو پچھلی صدیوں میں بہت زیادہ نزاعی رہا ہے، یعنی اسلام کا عسکری یا شمشیری رول۔

ساتویں صدی عیسوی میں اسلام اس وقت کی بیشتر آباد دنیا میں داخل ہو گیا۔ اس کا یہ داخلہ معروف معنوں میں کوئی شمشیری داخلہ نہ تھا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ فطرت کا ایک آپریشن تھا۔ اس وقت ساری دنیا پر جمود کی حالت طاری تھی۔ سیاسی اعتبار سے ہر ملک میں جبر کی خاموشی چھائی ہوئی تھی، مذہبی دائرہ میں کلرجی یا مذہبی پیشواؤں نے انسانی سوچ کو محدود خول میں بند کر دیا تھا۔ کلچر کے نام سے اس زمانہ میں جو چیز پائی جاتی تھی وہ صرف توہماتی روایات کا ایک ڈھانچہ تھا جس کا عقل انسانی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عام انسان جہالت کے اندھیرے میں زندگی گزار رہے تھے۔ نسل در نسل انسانیت کا حال یہ تھا کہ لوگ پیدا ہوتے تھے صرف اس لئے کہ وہ اس طرح مر جائیں کہ تاریخ میں ان کی کوئی خبر بھی درج نہ ہو۔ اس قبرستانی سناٹے سے انسانیت کو نکالنے کے لئے ایک عظیم ٹھوکر درکار تھی۔ یہ ٹھوکر بظاہر کسی قوم کے ذریعہ دی جانے والی تھی مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ فطرت کی ایک ٹھوکر تھی۔ جس طرح زلزلہ فطرت کے زور پر آتا ہے اسی طرح یہ ٹھوکر بھی براہ راست طور پر فطری قانون کے زور پر وجود میں آئی۔ اس ٹھوکر کے بغیر یہ ممکن نہ تھا کہ دنیا جامد دور سے نکل کر زندہ اور متحرک دور میں داخل ہو۔ اہل اسلام کے ذریعہ دنیا کو یہی تعمیری ٹھوکر دی گئی۔ یہ زیادہ بڑے پیمانہ پر ویسی ہی ایک ٹھوکر تھی جو کیرم بورڈ پر پیش آتی ہے۔ ایک کھلاڑی اپنے ماسٹر اسٹروک کے ذریعہ بورڈ کی تمام گوٹوں کو متحرک کر دیتا ہے، وہ ان کے سٹاٹو کو حرکت اور سفر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اہل اسلام جب عرب سے نکل کر وسیع تر دنیا میں داخل ہوئے تو ان کا یہ داخلہ گویا فطرت کا ایک سیلاب تھا جس نے زندگی کی تمام سرگرمیوں کو یک لخت بدل دیا۔ سیاسی نقشے ٹوٹ گئے۔ مذہبی روایتیں ڈھہ پڑیں۔ تجارت و زراعت کے تمام شعبوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔ انسانوں کا فکری جمود ٹوٹ کر فکری انقلاب میں تبدیل ہو گیا۔

اس دنیا میں ہر بڑی تبدیلی کے لئے فطرت کا ایک ہی عالمگیر اصول ہے اور وہ شاک ٹریٹمینٹ کا اصول ہے۔ اس دنیا کی تمام اہم تبدیلیاں اسی اصول کے تحت وقوع میں آتی ہیں۔

مسلمانوں کے لئے عرب کے مشرکین کا سخت جارحانہ رویہ اسی قسم کا ایک شاک ٹریٹمنٹ تھا۔ کروسیڈس (Crusades) کی دو سو سالہ جنگ یورپ کی مسیحی قوموں کے لئے اسی قسم کا ایک شاک ٹریٹمنٹ تھا جو انھیں مسلمانوں کے ذریعہ دیا گیا۔ اسی شاک ٹریٹمنٹ کے نتیجہ میں اس نئے یورپ کا جنم ہوا جس کو نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ اسی طرح جاپان کے لئے ایک شاک ٹریٹمنٹ کے ہم معنی تھی جس سے وہ نیا جاپان ابھرا جو ایک عالمی اقتصادی طاقت بن گیا۔ اسی طرح اب مغربی دنیا کا معاملہ مسلمانوں کے حق میں ایک شاک ٹریٹمنٹ کے ہم معنی ہے۔ فطرت کے قانون کے مطابق، یہ یقینی ہے کہ اس شاک ٹریٹمنٹ کے بطن سے مسلمانوں کا ایک نیا دور شروع ہو اور ان کو دوبارہ ایک عالمی طاقت بنانے کا ذریعہ ثابت ہو۔

مسلمان اس طرح اپنی ابتدائی صدیوں میں ساری دنیا کے لئے ایک شاک ٹریٹمنٹ دینے والے بن گئے۔ ان کے فاتحانہ اقدامات نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کی تقریباً تمام قوموں کو ہلا دیا۔ اس نے ان قوموں کو لمبی نیند سے جگا کر متحرک اور بیدار کر دیا۔ مسلمانوں کا بدنام شمشیری رول درحقیقت مثبت سرجری کا ایک رول تھا۔ اس نے ان کی چھپی ہوئی فطری صلاحیتوں کو بیدار کر دیا۔ اس نے بیمار قوموں کو دوبارہ صحت مند بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس نے جہل اور توہمات کی سیاہ چادر کو پھاڑ کر انھیں اس قابل بنا دیا کہ وہ فطرت کے روشن سورج سے اپنے آپ کو منور کر سکیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ ایک قوم پر دوسری قوم کا حملہ نہ تھا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ فطرت کا ایک ناگزیر آپریشن تھا۔ یہ کام مسلمانوں سے لیا گیا، کیوں کہ اس وقت کی تمام قوموں میں وہی اس مقصد کے لئے سب سے زیادہ اہل تھے۔ وہ ایک تازہ دم گروہ تھے۔ ان میں اعلیٰ انسانی صفات پوری طرح موجود تھیں۔ ان کے پاس زندگی کا ایک پیغام تھا۔ وہ رائج الوقت نظاموں کے مقابلہ میں ایک بہتر آئیڈیالوجی رکھتے تھے۔ مزید یہ کہ ان کے پاس جہاد کا نظریہ تھا جو انسان کو قریبی مفاد سے اوپر اٹھ کر برتر اور اعلیٰ تر مقصد کے لئے متحرک کرتا ہے اور اس کو قربانی کی حد تک جا کر جدو

جہد کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کی یہی صفات تھیں جس نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ فطرت کے ایک عالمی انقلابی رول کو ادا کرنے کے لئے چن لئے جائیں۔

فطرت کے اس قانون کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں سے دفع نہ کرتا تو زمین فساد سے بھر جائے۔ (البقرہ ۲۵۱)

فطرت کے اس قانون کو مذکورہ آیت میں قانونِ دفع کہا گیا ہے۔ اس کا تعلق کسی ایک قوم سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام قوموں سے ہے۔ ہر قوم کچھ مدت کے بعد اس قانون کی زد میں آجاتی ہے مثال کے طور پر عرب مسلمانوں کے ذریعہ پہلے دوسری قوموں کو "ٹھوکر" دی گئی۔ اس کے بعد منگولوں اور سلجوقیوں کے ذریعہ عربوں کو اس ٹھوکر کا سابقہ پیش آیا۔ اس کے بعد جب مغل اور سلجوق حکمراں جمود کا شکار ہوئے تو دوبارہ انہیں مغربی قوموں کے ذریعہ ٹھوکر لگادی گئی۔ موجودہ مسلمان اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ دفع اقوام کا یہ معاملہ، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، فطرت کا ایک آپریشن ہوتا ہے۔ قوموں کو چاہئے کہ وہ اس معاملہ کو اسی نظر سے دیکھیں تاکہ ان کے اندر مثبت ذہن پیدا ہو۔ ایسے موقع پر منفی ذہن تباہی میں اضافہ کرتا ہے، اور مثبت ذہن ان کو دوبارہ زیادہ بہتر تعمیر کے قابل بنادیتا ہے۔

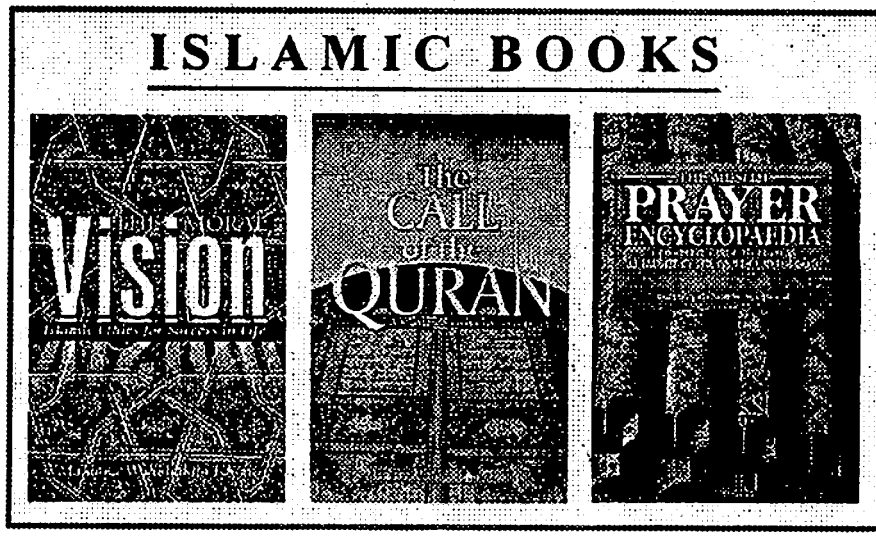

قاتل انسانیت

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایاکم والحسد، فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب. (ابوداؤد، کتاب الأدب، باب الحسد، ابن ماجہ، کتاب الذہد) یعنی تم حسد سے بچو، کیوں کہ حسد اسی طرح نیکیوں کو کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: لا یجتمعان فی قلب عبدٍ الایمان والحسد (النسائی، کتاب الجہاد) یعنی کسی بندے کے دل میں ایمان اور حسد جمع نہیں ہو سکتے۔

حسد قاتلِ ایمان اور قاتل انسانیت ہے۔ حسد کا نقصان یہ ہے کہ وہ آدمی سے اعلیٰ ایمانی کیفیات کو چھین لیتا ہے۔ حسد اس میں رکاوٹ بن جاتا ہے کہ آدمی کے سینہ میں وہ دینی جذبات پرورش پائیں جو اس کو اللہ کے قریب کرنے والے ہیں اور جس کا انعام اس کو جنت کی صورت میں ملے گا۔

موجودہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ایک شخص بظاہر بڑا ہو جاتا ہے اور دوسرا شخص بظاہر چھوٹا۔ یہ امتحان کے لئے ہوتا ہے۔ وہ اس لئے ہے کہ اس فرق کو خدائی فیصلہ سمجھ کر اسے قبول کر لیا جائے مگر جب آدمی بڑے کی بڑائی کا اعتراف نہ کرے اور اس کو چھوٹا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جائے تو گویا کہ وہ خدا کے فیصلہ کو بدلنا چاہتا ہے۔ ایسا آدمی خدا کی قربت کی لذتوں سے محروم رہے گا۔

حقوق العباد کے سلسلہ میں سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی کے دل میں دوسرے انسانوں کے لئے شفقت اور ہمدردی کا جذبہ ہو مگر حسد آدمی کے اندر سے انسانی ہمدردی کا جذبہ ختم کر دیتا ہے۔ اس کا نقصان اس کو اس بدترین صورت میں ملتا ہے کہ وہ اس حدیث کا مصداق بن جاتا ہے: لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس (البخاری، کتاب التوحید) یعنی اللہ اس آدمی پر رحم نہیں کرے گا جو انسانوں پر رحم نہ کرے۔

قرآن میں تقویٰ کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ کسی سے دشمنی ہو تب بھی آدمی اس کے بارے میں عدل و انصاف کی بات کہے (المائدہ ۸)۔ مگر جس آدمی کے دل میں کسی کے خلاف حسد اور جلن ہو اس کے بارے میں انصاف کی بات کہنا اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ حسد کا جذبہ اس کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے محسود کے بارے میں وہ بات کہے جس میں اس کے دل کو تسکین ملتی ہو نہ کہ وہ بات جو بطور واقعہ درست ہو۔ اس طرح حسد آدمی کو خدا کی نظر میں ظلم اور بے انصافی کا مجرم بنا دے گا۔

انسانیت کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر موضوعیت (objectivity) ہو۔ وہ لوگوں کے بارے میں غیر جانبدارانہ رائے قائم کرے۔ وہ معاملات کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھ سکے۔ اس قسم کی حقیقت پسندی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ مگر حسد آدمی کے لئے اس میں مانع بن جاتا ہے کہ وہ بے آمیز رائے قائم کر سکے۔ حسد آدمی کے اندر متاثر ذہن پیدا کر دیتا ہے، اور متاثر ذہن کے ساتھ آدمی کبھی کوئی بڑی ترقی نہیں کر سکتا۔ حسد بلاشبہہ خود حاسد کے لئے سب سے بڑی محرومی ہے۔

قرآن و حدیث کے مطابق صدقہ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ اس صدقہ کا تعلق صرف مال سے نہیں ہے بلکہ دل اور زبان سے بھی ہے۔ یہ بھی ایک عظیم صدقہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے انسان کے بارے میں اچھی رائے رکھے۔ وہ اس کا خیر خواہ ہو۔ وہ اچھے الفاظ میں اس کا تذکرہ کرے۔ وہ اس کے حق میں نیک دعائیں کرے۔ مگر جب ایک آدمی کے دل میں دوسرے انسان کے لئے حسد کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ اس عظیم نیکی سے محروم ہو جائے گا۔ اس کی زبان دوسرے انسان کے لئے کھلے گی تو اس کی برائی کے لئے کھلے گی نہ کہ اس کی بھلائی کے لئے۔ اس کا سینہ ایسے انسان کے خلاف نفرت سے بھر جائے گا۔ اس طرح حسد ایک آدمی کو اس آخری نیکی سے بھی محروم کر دیتا ہے کہ وہ کسی کے حق میں کلمۂ خیر بول سکے۔ یہ ایک ایسی محرومی ہے جس سے بڑی محرومی شاید کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

فہم دین: ایک اصول

عربی زبان میں کہا جاتا ہے لا یضربنك زید۔ لفظی ترجمہ کے اعتبار سے بظاہر اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ زید تم کو ہر گز نہ مارے۔ مگر بااعتبار حقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ زید تم کو مارنے نہ پائے۔ تم ایسی کارروائی نہ کرو جس کے بعد زید کو تمہیں مارنے کا موقع مل جائے۔ گویا اس جملہ میں خطاب کا رخ ضارب کی طرف نہیں ہے بلکہ مضروب کی طرف ہے۔

۱۔ عربی زبان کا یہ اسلوب قرآن میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فلا ینازعنك فی الامر وادع الیٰ ربك (الحج ۶۷) اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ پس وہ ہر گز تم سے جھگڑا نہ کریں اور تم اپنے رب کی طرف دعوت دو۔ مگر یہاں بھی وہی اسلوب ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ یعنی بظاہر آیت کا رخ مدعو کی طرف ہے مگر حقیقۃً اس کا رخ داعی کی طرف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مدعو کو نزاع برپا کرنے کا موقع نہ دو۔ نزاع سے اعراض کرتے ہوئے اپنی ساری توجہ دعوت کے اوپر لگائے رہو۔

یہ بلاغتِ کلام کا ایک اہم اصول ہے۔ بعض مواقع پر بظاہر خطاب کا رخ ایک چیز کی طرف ہوتا ہے مگر حقیقۃً کلام کے اعتبار سے اس کا رخ کسی اور چیز کی طرف ہوتا ہے۔ یہ نکتہ کلام کے موقع و محل کے مطالعہ سے سمجھ میں آتا ہے۔

۲۔ قرآن میں اس اسلوب کی ایک مثال سورہ نمبر ۸۰ میں پائی جاتی ہے۔ اس سورہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ اندھا اس کے پاس آیا۔ اور تم کو کیا خبر کہ وہ سدھر جائے یا نصیحت کو سنے تو نصیحت اس کے کام آئے۔ جو شخص بے پروائی برتتا ہے، تم اس کی فکر میں پڑتے ہو، حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ نہ سدھریں۔ (عبس ۷)

ان آیات میں بظاہر رسول اللہ ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک نابینا صحابی عبد اللہ بن ام مکتوم سے اعراض کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ پر بطور عتاب یہ سورہ نازل

فرمائی (تفسیر القرطبی ۱۹/۲۱۰) مگر یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی بلاغت کا وہی اصول اختیار کیا گیا ہے جس کے مطابق بظاہر خطاب کسی ایک سے کیا جاتا ہے مگر اصل مقصود کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی خطاب کا اصل رخ اشراف قریش کی طرف ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اشراف قریش پر اپنا عتاب ظاہر فرمایا ہے جو حق کے مقابلہ میں سرکشی کا طریقہ اختیار کئے ہوئے تھے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شریف آدمی کا بیٹا گھر سے باہر جائے۔ وہاں محلہ کا ایک شریر لڑکا اس سے الجھ جائے۔ اس کے بعد باپ گھر سے باہر آئے۔ وہ شریر لڑکے کی طرف نہ دیکھے بلکہ اپنے بیٹے کو تنبیہ کرتے ہوئے کہے کہ تم کو یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی۔ تم کو اپنے گھر میں ہوم ورک کرنا چاہئے تھا۔ نہ کہ تم ان لڑکوں کے پاس آکر ان کے ساتھ بیٹھو۔ اس کلام میں باپ کا خطاب بظاہر اپنے بیٹے کی طرف ہے مگر حقیقۃً وہ شریر لڑکے کے خلاف بیزاری کا اظہار ہے۔

۳۔ اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے اپنی دعوتِ رسالت پیش کی تو فرعون نے اپنے درباریوں کو خطاب کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کے بارے میں کہا کہ: یرید ان یخرجکم من ارضکم (الاعراف ۱۱۰) یعنی موسیٰ یہ چاہتے ہیں کہ وہ تم لوگوں کو تمہاری زمین سے نکال دیں۔ اس آیت کو کچھ لوگوں نے ظاہر معنیٰ میں لے لیا۔ مثلاً سید قطب مصری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ فرعون نے درباریوں سے کہا کہ: انها الخروج من الارض.....انها ذهاب السلطان (فی ظلال القرآن ۳/۱۳۴۸) یعنی فرعون نے کہا کہ یہ ہمارے لئے ملکِ مصر سے نکل جانا ہے اور یہ ہمارے اقتدار کا چھن جانا ہے۔ سورۃ الشعراء کی ایک آیت کی تشریح کے تحت بھی سید قطب نے یہی بات لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو فی ظلال القرآن ۵/۲۵۹۴۔ (مگر یہ تشریح درست نہیں)

فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ کی پوری تقریر کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ پیغمبر نے جو بات کہی تھی وہ فرعون کے قول کے بالکل برعکس تھی۔ فرعون حضرت موسیٰ کے

خلاف یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ہم کو ہمارے ملک سے نکال کر اس کے اوپر خود سیاسی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ حضرت موسیٰ نے برعکس طور پر فرعون سے یہ کہا تھا کہ : فارسل معی بنی اسرائیل (الاعراف ۱۰۵) یعنی مجھ کو اجازت دے کہ میں اپنی قوم بنی اسرائیل کو لے کر ملکِ مصر سے باہر چلا جاؤں۔ گویا حضرت موسیٰ تو خود اپنے لئے مصر سے نکلنے کی بات کر رہے تھے۔ لیکن فرعون نے اس کو الٹ کر کہا کہ موسیٰ ہم لوگوں کو ہمارے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ فرعون نے جب یہ بات اپنے درباریوں سے کہی تو اس کا مقصد حضرت موسیٰ کے مشن کو بتانا نہیں تھا بلکہ خود اپنے لوگوں کو موسیٰ کے خلاف بھڑکانا تھا۔ چنانچہ اس نے غلط بیانی کر کے حضرت موسیٰ کی طرف وہ بات منسوب کر دی جو انہوں نے کبھی نہیں کہی تھی۔ فرعون کے کلام کا رخ موسیٰ کی طرف نہ تھا بلکہ خود اپنے درباریوں کی طرف تھا۔

مذکورہ تفسیر کی غلطی یہ ہے کہ اس میں موسیٰ کے مشن کو فرعون کے کلام سے نکالا جا رہا ہے جب کہ موسیٰ کا مشن خود موسیٰ کے کلام سے نکلے گا نہ کہ ان کے دشمن فرعون کے کلام سے۔

حدیث کی مثال

کلام کا یہ اسلوب حدیث میں بھی پایا جاتا ہے۔ حدیث کے ذخیرے میں بہت سی روایتیں ہیں جن کو سمجھنے کے لئے اس نکتہ کو جاننا ضروری ہے۔ ورنہ حدیث کی اصل روح کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔

۴۔ مثال کے طور پر بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ : الصلوۃ المکتوبۃ واجبۃ خلف کل مسلم ، برا کان او فاجراً (سنن ابی داؤد ۱/۱۵۹) یعنی مکتوب نمازوں کی ادائیگی ہر مسلم امام کے پیچھے واجب ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد ہو۔ اس حدیث میں خطاب کا رخ بظاہر امام کی طرف ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے مراد مومم یا مقتدی ہے۔ اس حدیث کا مقصود امام کے مسئلہ کو بتانا نہیں ہے بلکہ مقتدی کے مسئلہ کو بتانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی کی نظر میں اس کی مسجد کا امام خواہ بظاہر نیک ہو یا بد، اگر وہ مسجد کا باضابطہ امام ہے تو مقتدی کو

ہر حال میں اس کے پیچھے نماز پڑھنا چاہئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی خود اپنی نماز پڑھتا ہے نہ کہ امام کی نماز۔ حدیث میں آیا ہے کہ: لکل امرئ ما نوی (صحیح البخاری) یعنی ہر آدمی کے لئے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ مسجد میں امام مقرر کرنے کا مقصد نماز باجماعت کی تنظیم ہے۔ امام اگر اچھا ہو تب بھی اس کی وجہ سے مقتدی کی نماز اچھی نہیں ہو جائے گی اور اگر بالفرض امام برا ہو تب بھی اس کی وجہ سے مقتدی کی نماز بری نہیں ہو جائے گی۔ مذکورہ حدیث کا مقصد مسجد کے ماحول کو انتشار و افتراق سے بچانا ہے نہ کہ کسی مقتدی کی نماز کا حکم بتانا۔

۵۔ اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ: اذا وضع الطعام فاخلعو نعالکم فانه اروح لاقدامکم (الدارمی، کتاب الاطعمۃ) یعنی جب کھانا رکھا جائے تو اپنے جوتے کو اتار دو۔ کیوں کہ اس میں تمہارے پیروں کے لئے زیادہ راحت ہے۔

یہ حدیث بھی اسی اسلوب کلام پر ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ چنانچہ اس حدیث میں حقیقۃً یہ مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے کہ کھانے کے وقت جوتا اتار دو بلکہ اس میں راحت کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی جب کھانا کھانا ہو تو جوتے اتار کر سکون کے ساتھ بیٹھو اور شکر الٰہی کے جذبہ کے ساتھ کھانا کھاؤ۔ تاہم اگر سردی کا موسم ہو اور جوتا اتارنا راحت کے خلاف ہو تو اس وقت حدیث کا مدعا یہ ہوگا کہ پاؤں کی راحت کی خاطر جوتا پہنے ہوئے کھانا کھایا جائے تاکہ آدمی کی دلجمعی میں فرق نہ آئے اور وہ پوری طرح احساس شکر کے ساتھ کھانا کھا سکے۔

۶۔ اسی طرح حدیث میں متعدد روایتیں آئی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سا کھانا پسند تھا۔ مثال کے طور پر حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھانے میں شہد اور میٹھا پسند فرماتے تھے۔ اس کو لے کر کچھ لوگوں نے یہ مسئلہ نکال لیا کہ حلوہ کھانا سنت ہے، حلوہ کھانا باعث ثواب ہے۔ مگر ان احادیث کا یہ مطلب نہیں۔

کھانے کے سلسلہ میں جو روایتیں آئی ہیں وہ تقریباً سب کی سب مدنی دور سے متعلق ہیں۔

یعنی ان روایتوں کا تعلق اس دور سے ہے جب کہ مسلمانوں کے لئے سنگین معاشی مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ پسندیدہ غذا کیا ہے۔ بلکہ اصل یہ تھا کہ جو کچھ ملے اس کو شکر اور قناعت کے جذبہ کے تحت کھالیا جائے۔ کھانے کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے پسندیدگی کے کلمات کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔

اس وقت مدینہ میں جن کھانوں کا رواج تھا ان سب کا نام ان احادیث میں آیا ہے۔ ان حدیثوں کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مدینہ کے تمام ہی کھانے رسول اللہ ﷺ کی پسند کے مطابق تھے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا تو درست ہو سکتا ہے کہ مدینہ میں پائے جانے والے تمام کھانے رسول اللہ ﷺ کو پسند تھے۔ مگر یہ بات درست نہیں کہ آدمی ان میں سے کسی ایک روایت کو لے لے اور اس کی بنیاد پر کہے کہ فلاں چیز رسول اللہ ﷺ کو پسند تھی اور اس کو سنت کا نام دے دے۔ سنت ہر چیز کو پسندیدگی کے ساتھ کھانے کا نام ہے نہ کہ کسی ایک چیز کو۔

اسلام کے دور اول میں مدینہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس کے معاشی ذرائع محدود تھے۔ جب ہجرت ہوئی اور اچانک مدینہ کی آبادی تقریباً دگنا ہو گئی تو فطری طور پر وہاں معاشی مسائل پیدا ہو گئے۔ مزید یہ کہ ہجرت کے بعد غزوات و سرایا کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور مدینہ کے معاشی وسائل کا بڑا حصہ مستقل طور پر دفاعی ضرورتوں میں صرف ہونے لگا۔ ان اسباب سے مدینہ میں معاشی تنگی کی صورت پیدا ہو گئی۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور اکثر اصحاب کو روزانہ وقت پر کھانا نہیں ملتا تھا۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا: توفی رسول اللہ وما شبعنا من الاسودین (البخاری، مسلم) یعنی مدینہ میں رسول اللہ کی وفات ہو گئی اور ہم کبھی دو چیز سے شکم سیر نہ ہو سکے (کھجور اور پانی)

ان حالات میں بار بار ایسے مواقع پیش آتے تھے کہ ایک انصاری کو یہ خبر ملتی کہ رسول اللہ نے ایک یا دو وقت سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ وہ دوڑ کر آپ کے پاس آتا اور آپ کو اپنے گھر لے

جاتا۔اس کے بعد بغیر کسی تیاری کے گھر میں جو کچھ ہوتا وہ اس کو آپ کے سامنے پیش کر دیتا۔یہ زیادہ تر ایسا معمولی کھانا ہوتا تھا کہ انصاری کو اسے رسول اللہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔(ماعاب رسول اللہ ﷺ طعاما قط)۔

مزید یہ کہ آپ تمام شریفوں سے زیادہ شریف انسان تھے۔جب کوئی انصاری آپ کے سامنے شرمندگی کے ساتھ ایک معمولی کھانا رکھتا تو آپ یہ کہہ کر کھانا شروع کر دیتے کہ یہ تو بہترین کھانا ہے۔اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں، خواہ یہ کھانا سوکھی روٹی اور سرکہ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کا یہ قول بظاہر کھانے کے بارے میں ہوتا تھا مگر حقیقۃً اس کا رخ میزبان کی طرف ہوتا تھا۔ آپ میزبان کی شرمندگی مٹانے کے لئے یا اس کی عزت رکھنے کے لئے ایسا کہتے تھے نہ کہ کھانے کی لذت بتانے کے لئے۔گویا کلام کا رخ اگرچہ بظاہر دستر خوان کی طرف ہوتا تھا مگر اس کا حقیقی رخ میزبان کی طرف ہوتا تھا جو شرمندگی کا احساس لئے ہوئے وہاں موجود ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں، ان کو اگر ظاہر معنیٰ میں لیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ رسول اللہ کو متضاد قسم کے کھانے پسند تھے۔میٹھا بھی اور نمکین بھی، گوشت بھی اور سبزی بھی، حتیٰ کہ سالن بھی اور بے سالن بھی۔اصل یہ ہے کہ مومن کے سامنے جب کوئی کھانا آتا ہے تو وہ اس کو نعمت خداوندی کی نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ لذت زبان کی نظر سے۔اس لئے مومن کو ہر کھانا خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رزق معلوم ہوتا ہے۔اس بنا پر وہ ہر کھانے کو خوش ہو کر کھالیتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ : ان اللہ لیرضی عن العبد ان یأکل الاکلة فیحمدہ علیھا، آو یشرب الشربة فیحمدہ علیھا (صحیح مسلم) یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ بندہ جب کوئی چیز کھائے تو اس پر وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔یا کوئی چیز پیے تو اس پر وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ مومن شکر کی کیفیت کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں کمال درجہ پر تھے۔ اور جو آدمی کھانا کھاتے وقت شکر کی کیفیت سے لبریز ہو اس کو خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز اچھی لگے گی۔ وہ ہر چیز کو یکساں طور پر خدا کی نعمت سمجھے گا۔ وہ ہر جائز خوراک کو یکساں پسندیدگی کے ساتھ کھائے گا ـــــ کھانے کی کسی چیز کو پسند نہ کرنا، اسے لگے گا جیسے کہ وہ خدا کی ایک نعمت کی ناقدری کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں اس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان میں قدیم عرب کے تقریباً تمام قابلِ حصول کھانوں کا ذکر ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جو بھی کھانا آیا اس کو آپ نے پسندیدگی کی نظر سے کھایا۔ اگر آپ کے سامنے روٹی اور نمک لایا گیا تو آپ نے اس کو بھی شوق سے کھایا اور آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: سید ادامکم الملح (ابن ماجہ، ابواب الاطعمۃ) کیوں کہ آپ جو کچھ کھاتے تھے جذبۂ شکر کے ساتھ کھاتے تھے، نہ کہ جذبۂ لذت کے ساتھ۔

آپ نے فرمایا کہ اگر کسی کے پاس روٹی کا ٹکڑا اور پانی (جلف الخبز والماء) ہو تو گویا کہ اس کو دنیا کی بہترین نعمت کھانے کے لئے مل گئی۔

یہاں ہم کھانے کی ان چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جو سنن ابن ماجہ (ابواب الاطعمہ) اور مشکاۃ المصابیح (کتاب الاطعمہ) میں منقول ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

الثرید (شوربے میں تر کی ہوئی روٹی) القرع (کدو) اللحم (گوشت) الملح (نمک) الخل (سرکہ) الزیت (زیتون کا تیل) اللبن (دودھ) الحلواء (میٹھی چیز) العسل (شہد) البطیخ (تربوز۔ خربوز) التمر (کھجور) الذبد (مکھن) المرقۃ (شوربہ) الشعیر (جو) القثاء (ککڑی) الثفل (تلچھٹ)، وغیرہ۔

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم عرب قبائل میں جو کھانے رائج تھے، ان سب کے بارے میں آپ نے پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ خواہ وہ انتہائی معمولی قسم کا کھانا کیوں نہ ہو۔ ایسی حالت میں کوئی شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ آپ کو تمام کھانے پسند تھے مگر کوئی سنجیدہ آدمی ایسا

نہیں کر سکتا کہ وہ ان میں سے کسی ایک چیز کو لے کر یہ دعویٰ کرے کہ رسول اللہ ﷺ کو فلاں کھانا پسند تھا۔ ان روایتوں کے مطالعہ کے بعد جائز طور پر صرف دو بات کہی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ ہر کھانے کو آپ خدائی رزق کے طور پر دیکھتے تھے۔ اس لئے ہر کھانے کو آپ شکر اور پسندیدگی کے جذبہ سے تناول فرماتے تھے۔ دوسرے یہ کہ کبھی ایسا ہوتا کہ آپ ایک غریب میزبان کے پیش کئے ہوئے معمولی کھانے کی اس طرح تعریف فرماتے تھے جیسے کہ وہ بہترین کھانا ہو، یہ تعریف غریب میزبان کی عزت افزائی کے لئے ہوتی تھی نہ کہ اپنی تعریف کے اظہار کے لئے۔

۷۔ قرآن میں ہدایت پائے ہوئے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **الذین یستمعون القول فیتبعون احسنه اولئك الذین هداهم الله اولئك هم اولوا الالباب** (الزمر ۱۸) یعنی تم میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دو جو میری بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر وہ اس کے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔

اس آیت کو اگر محض لفظی اعتبار سے دیکھا جائے تو بظاہر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ قرآن یا پیغمبر کے کلام میں احسن پہلو بھی ہو سکتا ہے اور غیر احسن پہلو بھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قول کا غیر احسن پہلو صرف سننے والے کے دماغ میں ہوتا ہے نہ کہ خود قول میں۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس لئے اگر کوئی آدمی چاہے تو وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے ایک سیدھی بات کا بھی الٹا مفہوم نکال سکتا ہے۔

اس غلطی سے بچنے کا راز صرف یہ ہے کہ آدمی کے سامنے جب کوئی بات آئے تو وہ کامل سنجیدگی کے ساتھ اسے دیکھے۔ وہ پوری دیانت داری کے ساتھ یہ کوشش کرے کہ مجھے قول کا وہی مفہوم لینا ہے جو صاحب قول کی اصل مراد ہے۔ نہ کہ وہ مفہوم جو میرے اپنے دماغ میں ہے۔ آدمی کی سنجیدگی اور دیانت داری اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ تعبیر یا غلط تشریح سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

امتحان کا پرچہ

ایک آدمی کے سامنے گلاب کا ایک درخت ہے۔ وہ اس کا خوبصورت پھول توڑنا چاہتا ہے۔ اگر وہ تیزی کرے اور جلدی سے ہاتھ بڑھا کر پھول توڑے تو عین ممکن ہے کہ اس کا ہاتھ زخمی ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ گلاب کے درخت کی شکایت کرے یا باغ کے مالی سے الجھ جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ یہ مسئلہ باغ کے مالی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ وہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ مذکورہ شخص کی غلطی یہ ہے کہ وہ بے صبری کر کے فطرت سے ٹکرا گیا۔ حالانکہ فطرت سے ٹکرا کر کوئی بھی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہ صرف گلاب کے پودے کا معاملہ نہیں بلکہ یہی پوری دنیا کا معاملہ ہے۔ جس طرح گلاب کے پیڑ میں پھول بھی ہیں اور اسی کے ساتھ کانٹے بھی، اسی طرح دنیا میں ہر طرف مسائل بھی ہیں اور مواقع بھی۔ جو لوگ مسائل میں اپنے آپ کو الجھائیں ان کی مثال اس نادان شخص کی سی ہے جو گلاب کے پیڑ میں کانٹے کو دیکھے اور اس سے الجھ جائے۔ اس کے برعکس جو لوگ مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کریں وہ اس دانش مند کی طرح ہیں جو اپنے آپ کو کانٹوں سے بچائے اور احتیاط کے ساتھ پھول کو حاصل کر لے۔

دنیا کی یہ صورت حال اتفاقی نہیں ہے۔ یہ خود اللہ کے منصوبہ کا ایک حصہ ہے۔ اللہ نے انسان کو آزمائش کے لئے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ پوری دنیا اسی کے مطابق بنائی گئی ہے۔ دنیا میں پھول کے ساتھ کانٹے ہونا یا مواقع کے ساتھ مسائل کا پایا جانا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ انسان کے لئے آزمائش کا پرچہ ہے۔ انسان کا خالق یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ کون ہے جو اپنے آپ کو منفی جذبات سے بچاتا ہے اور اپنے اندر مثبت نفسیات کی پرورش کرتا ہے۔ خدا کا مطلوب انسان وہ ہے جو منفی حالات میں بھی مثبت طرز فکر کا ثبوت دے، جو اشتعال والے حالات میں بھی مشتعل ہوئے بغیر رہ سکے۔

مذہب اور سائنس

انسانیات (anthropology) کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مذہب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنا کہ انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ جب سے انسان زمین پر موجود ہے اسی وقت سے مذہب بھی یہاں موجود رہا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا انسانی معاشرہ دریافت نہیں ہوا ہے جس کے اندر مذہب نہ پایا جاتا ہو۔ حتیٰ کہ موجودہ زمانہ جس کو کچھ پر جوش لوگ لامذہبیت کا زمانہ سمجھتے ہیں وہ بھی یقینی طور پر مذہب سے خالی نہیں ہے۔ آج بھی مذہب اتنا ہی زندہ ہے جتنا کہ وہ اس سے پہلے زندہ تھا۔

موجودہ زمانہ میں روایتی مذہبی طبقہ کے علاوہ اہل علم کا جو نیا طبقہ پیدا ہوا، جس کو عام طور پر ماڈرن طبقہ کہا جاتا ہے، وہ وسیع تر تقسیم میں دو گروہوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جو اپنے دعویٰ کے مطابق خدا اور مذہب کا منکر ہے۔ اس قسم کے افراد کو عام طور پر ملحد (Atheist) کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اگرچہ مذہب کے روایتی فارم سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کرتا، تاہم وہ خود اپنی تشریح کے مطابق، اپنے آپ کو خدا اور مذہب کا ماننے والا بتاتا ہے۔ پہلے گروہ کی ایک ممتاز شخصیت کے اعتبار سے انگریز فلسفی برٹرینڈ رسل (1872-1970) کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دوسرے گروہ کی ایک مثال مشہور جرمن سائنس داں البرٹ آئنسٹین (1879-1955) ہے۔

پہلا گروہ: برٹرینڈ رسل

برٹرینڈ رسل ایک غیر معمولی ذہین آدمی تھا۔ اس کو لمبی عمر ملی۔ وہ اپنی نوجوانی کے زمانے سے لے کر بڑھاپے کی عمر تک مسلسل مطالعہ کرتا رہا۔ اس کی سوانح عمری اور اس کی دوسری کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی عمر میں اس کو سب سے زیادہ جس چیز سے دلچسپی ہوئی وہ یقینیت (certainty) تھی۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے علم کا طالب تھا مگر وہ اس علم کو حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے واقعہ ہونے پر وہ یقین کر سکے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر اس کو سب سے پہلے میتھ میٹکس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں میرا احساس یہ تھا کہ

میں نے اپنے لئے مذہب کا ایک قابل اعتماد بدل پالیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو نظر آیا کہ میتھ میٹکس میں منطقی تیقن (logical certainty) موجود ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ میں نے میتھ میٹکس کی صورت میں اس علم کو پالیا ہے جس کو میرا ذہن تلاش کر رہا تھا۔ اس کے مقابلہ میں مذہب برٹرینڈ رسل کو توہمات (superstition) کا مجموعہ نظر آیا۔ چنانچہ اس نے مروجہ مذہب کو رد کر کے میتھ میٹکس کو اپنے دین کے طور پر اختیار کر لیا۔

مگر بعد کو جب برٹرینڈ رسل نے زیادہ تفصیلی مطالعہ کیا تو اس کا یہ یقین متزلزل ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ میرا یہ یقین حقائق کے سرسری مطالعہ پر مبنی تھا، حقائق کا زیادہ گہرا مطالعہ اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

برٹرینڈ رسل کے بعد کے مطالعہ کے نتائج کو اس کی کتاب انسانی علم (Human Knowledge) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں برٹرینڈ رسل نے قطعی دلائل کے ذریعہ دکھایا ہے کہ موجودہ دنیا میں انسانی مطالعہ کبھی بھی کسی کو یقینی علم تک نہیں پہنچا سکتا۔ ایک طرف انسانی محدودیتیں اور دوسری طرف کائنات کی پراسرار نوعیت (mysterious nature) فیصلہ کن طور پر یقینی علم کی راہ میں حائل ہیں۔ انسان کا مطالعہ آخر کار جہاں اس کو پہنچاتا ہے وہ تیقن (certainty) نہیں ہے بلکہ صرف قرینہ یا احتمال (probability) ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہم حقیقت (reality) کو براہ راست دریافت نہیں کر سکتے۔ ہم صرف یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ احتمالی طور پر یہاں فلاں حقیقت موجود ہے، اگرچہ وہ براہ راست ہمارے تجربہ میں نہیں آتی۔

برٹرینڈ رسل کو اس کے تمام عمر کے مطالعہ نے جہاں پہنچایا وہ ایک ایسا مقام تھا جہاں وہ حقیقی مذہب کے عین قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر اسلامی الفاظ استعمال کئے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ لا الٰہ کی منزل تک پہنچ چکا تھا، مگر اس کے بعد وہ الا اللہ کی منزل طے نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ اس کی موت ہو گئی۔

برٹرینڈ رسل کی یہ بات کہ انسانی علم ہم کو صرف قرینہ یا احتمال (probability) تک پہنچاتا ہے، یہ اس کی ذاتی بات نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام علماءِ سائنس کا موقف ہے۔ یہ اصول اب جدید علم کا ایک ایسا مسلمہ بن چکا ہے جس سے کسی بھی صاحب علم کو اختلاف نہیں۔

علمی تحقیقات کا اس حقیقت تک پہنچنا کہ اس دنیا میں، خالص علمی طور پر، ہم صرف قرینہ یا احتمال تک پہنچ سکتے ہیں، بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم موجودہ علم کے مطابق، سائنس اور مذہب کے درمیان وہ فرق ختم ہو چکا ہے جو قدیم زمانہ میں فرض کر لیا گیا تھا۔ اب عقل (reason) کا موقف بھی عین وہی ہے جو اس سے پہلے عقیدہ (belief) کا موقف تھا۔

مذہب کا موقف قدیم ترین زمانہ سے یہ تھا کہ سچائی یا حقیقت اپنی نوعیت میں ایک غیبی چیز ہے، وہ نہ دکھائی دینے والی دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے لئے صرف یہ ممکن ہے کہ ہم ظاہری قرائن کی بنیاد پر یہ مستنبط کریں کہ فلاں حقیقت یہاں موجود ہے۔ اگر چہ وہ دکھائی نہیں دیتی۔ اب سائنس کا موقف بھی عین یہی ہو چکا ہے۔ جدید سائنس کا کہنا ہے کہ ہم چیزوں کی اصل کو نہیں دیکھ سکتے، ہم چیزوں کے صرف ظاہری اثر (effect) کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور ظاہری اثر سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ فلاں چیز یہاں موجود ہے، اگر چہ بظاہر وہ ہمارے مشاہدہ اور تجربہ میں نہیں آتی۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے تمام لوگوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرینہ (probability) کی بنیاد پر مذہب کی واقعیت کو بھی اسی طرح مانیں جس طرح وہ سائنسی نظریات کی واقعیت کو مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ماننے کے بعد دوسرے کو نہ ماننے کی کوئی وجہ ان کے پاس موجود نہیں۔ ان حضرات کو جاننا چاہئے کہ اب ان کے لئے جن دو حالتوں کے درمیان انتخاب ہے وہ انکار مذہب اور اقرار مذہب نہیں ہے بلکہ وہ اقرار مذہب اور انکار خویش کے درمیان ہے۔ یہ حضرات اگر مذہب کے انکار پر مصر ہوں تو انہیں خود اپنا انکار بھی کرنا پڑے گا۔ چونکہ ان کے لئے اپنا انکار ممکن نہیں اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مذہب کا انکار کریں۔

دوسرا گروہ: آئنسٹائن

دوسرے گروہ کی ایک علامتی شخصیت آئنسٹائن ہے۔ آئنسٹین نے اپنی پوری زندگی سائنس کے مطالعہ میں گزاری۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اپنے اندر روحانی جذبات بھی پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے مذہب کا بھی مطالعہ کیا۔ مذہب کے بارے میں بھی اس کا عقیدہ اتنا ہی گہرا تھا جتنا کہ سائنس کے بارے میں اس کا عقیدہ گہرا تھا۔ تاہم اس کے نظریہ کے مطابق دونوں دو بالکل الگ الگ موضوعات تھے۔ اس کے الفاظ میں، سائنس کا موضوع یہ جاننا ہے کہ کیا ہے (what is) اس کے مقابلہ میں مذہب کا موضوع یہ جاننا ہے کہ کیا ہونا چاہئے (what should be) گویا مذہب کا تعلق داخلی یقین سے ہے اور سائنس کا تعلق خارجی معلومات سے۔

تاہم یہ تقسیم کافی نہیں۔ اس تقسیم کے باوجود وہ اصل سوال بدستور باقی رہتا ہے جس کی بنا پر سائنس اور مذہب کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ خالص علمی اعتبار سے مذکورہ تقسیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ اصل سوال مذہب اور سائنس دونوں کو ملانے کا ہے۔ مذہب علم الٰہی کا نام ہے اور سائنس علم انسانی کا نام۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ایسا فارمولا دریافت کریں جو علم الٰہی اور علم انسانی دونوں کو ایک کر سکے۔ اس کے بغیر انسان کے اندر وہ مطلوب شخصیت پیدا نہیں ہو سکتی جس کو علم نفسیات میں متکامل شخصیت (integrated personality) کہا جاتا ہے۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے لوگوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے علم کی نوعیت کو نہیں سمجھا۔ اس لئے وہ صحیح رائے تک نہ پہنچ سکے۔ اس طرح آئنسٹائن اور اس کے جیسے لوگوں کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے مذہب کی نوعیت کو نہیں سمجھا اور اپنی عدم واقفیت کی بنا پر مذہب کا ایک خود ساختہ تصور قائم کر لیا جو حقیقت سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ اس گروہ کے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ تمام مروجہ مذاہب کو مذہب کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب (major religions) ہیں۔ اس کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں دوسرے مذاہب موجود ہیں۔ یہ لوگ ان سب کو ملا کر مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مذہب کی تعلیمات ایک دوسرے سے

مختلف ہیں۔ان میں وہ یکسانیت نہیں پائی جاتی جو سائنس میں موجود ہے۔اس لئے وہ یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ مذہب ایک شخصی معاملہ ہے۔جو شخص جس مذہبی عقیدہ کو مانے وہی اس کا مذہب ہے، کسی دوسرے شخص کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

اس قسم کا مذہبی تصور خود مذہب کی نفی ہے۔مذہب کیا ہے۔مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ایسی مکمل آئیڈیالوجی کا نام ہے جو انسان اور کائنات کی اطمینان بخش توجیہہ کر سکے۔ جس میں انسان اپنے تمام داخلی اور خارجی سوالات کا جواب پالے۔مذہب آدمی کے لئے یقین کا سرچشمہ ہے۔جو مذہب کلی صداقت نہ ہو وہ انسان کو یقین کا سرمایہ نہیں دے سکتا۔اور جو مذہب انسان کو یقین نہ دے وہ مذہب بلاشبہہ مذہب بھی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ جدید اہل علم مذہب کے مطالعہ میں چند غلطیاں کرتے ہیں۔اس بنا پر وہ مذہب کو سمجھنے میں بھی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر موجود مذہب کو مستند مذہب سمجھ لینا اور اس بنیاد پر مذہب کا مطالعہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے توہماتی عقائد جیوتش (Astrology) اور فلکیات (Astronomy) سب کو یکجا کر کے اور پھر ان کے مجموعی مطالعہ سے ایک علم الافلاک بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس معاملہ میں سائنٹفک مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ غیر ثابت شدہ خیالات اور اوہام کو الگ کر دیا جائے اور صرف ثابت شدہ معلومات کی بنیاد پر علم افلاک وضع کیا جائے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہمیں مذہب کے مطالعہ میں بھی اختیار کرنا چاہئے۔ بطور واقعہ یہ درست ہے کہ آج کی دنیا میں مذہب کے نام سے بہت سے اعتقادی نظام پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کا گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص علمی اعتبار سے تمام مذاہب کی حیثیت یکساں نہیں۔

ان میں ایسے مذاہب ہیں جن کی کوئی معلوم تاریخ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام مذاہب ابتدائی طور پر ہی رد ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ جن مذاہب کو تاریخی اعتباریت (historical credibility)

حاصل نہ ہو وہ سرے سے اس قابل ہی نہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔ اسی طرح کتنے مذاہب ہیں جن کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ ان کا موجودہ متن (text) کسی تبدیلی کے بغیر آج موجود ہے، اور جس مذہب کا خود متن مشتبہ ہو اس کی صداقت پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے مختلف علمی معیار (scientific criteria) ہیں جن کا استعمال مذاہب کے مطالعہ میں ضروری ہے۔ مگر جب ان معیاروں کو موجودہ مذاہب پر منطبق کیا جاتا ہے تو یہ مذاہب اس علمی جانچ پر پورے نہیں اترتے۔

مذاہب کے پورے مجموعے میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو استثنائی طور پر اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ ہر قسم کی علمی جانچ پر پورا اترتا ہے۔ ایسی حالت میں تمام موجود مذاہب کو یکساں درجہ دے کر ان کا خلاصہ نکالنا ایک غیر علمی فعل ہے۔ اس معاملہ میں واحد درست موقف یہ ہے کہ ضروری علمی جانچ پر پورا اترنے والے مذہب کو لے لیا جائے اور جو مذاہب اس قسم کی علمی جانچ پر پورے نہ اتریں انہیں تاریخ کے کتب خانہ میں محفوظ کر دیا جائے۔

۲۔ اسلام کو مذہب کا مستند ایڈیشن (authentic version) ماننے کے بعد وہ تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جاتی ہیں جو مختلف مذاہب کو یکساں درجہ دینے کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کائنات کے بارے میں توہماتی عقائد کو الگ کر کے خالص سائنسی حقیقتوں کی بنیاد پر کائنات کا مطالعہ کرنا۔

۳۔ اسلام کو مذہب کا واحد نمائندہ ماننے کی صورت میں ہم کو ایک ایسا مستند ماخذ مل جاتا ہے جس کے ذریعہ مذہبی عقائد کا ایک غیر اختلافی نظام بنایا جا سکے۔ مثلاً مذاہب میں خدا کے بارے میں مختلف اور متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبری اور رسالت کے بارے میں سخت اختلافی نظریات موجود ہیں۔ موت کے بعد زندگی کی نوعیت کیا ہوگی، اس کے بارے میں بھی متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے تمام مذہبی عقائد و افکار کا ہے۔ مگر اسلام کو مذہب کے مستند ماخذ کی صورت میں لینے کے بعد ہمیں ایسے غیر اختلافی نظریات و عقائد

ٹل جاتے ہیں جن پر ہم یقین کر سکیں۔ یقین وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کے لئے انسان کو مذہب کی ضرورت ہے۔ اور تمام مذاہب کو یکساں ماننے کی صورت میں، اسی اصل مطلوب چیز سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔

۴۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ مذہب اور دنیوی معاملات کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہو۔ یہ ایک بے حد اہم سوال ہے جس کا جواب مختلف مذاہب میں مختلف انداز سے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں دنیوی معاملات کو مذہب کا لازمی جزء قرار دیا گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ لوگوں کو ناقابل عمل نظر آنے لگا۔ یہاں تک کہ چرچ اور ریاست میں وہ جنگ شروع ہوئی جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اس معاملہ میں اسلام نے نہایت اہم ہدایات دی ہیں۔ ان میں سے کچھ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

الف۔ اسلام میں ایک اہم تعلیم وہ ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: انتم اعلم بامور دنیاکم (صحیح مسلم) یعنی تم لوگ اپنی دنیا کے معاملہ میں زیادہ جانتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالص دنیوی نوعیت کے معاملات، مثلاً زراعت، باغبانی، شہری منصوبہ بندی، اقتصادی تنظیم جیسی چیزوں کو علمی ریسرچ کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔ یعنی علمی ریسرچ میں جو چیز انسانیت کے لئے مفید ثابت ہو گی وہی مذہب کے نزدیک بھی درست مانی جائے گی۔

ب۔ اسی طرح مذہب اور سیاسی حکمرانی کے معاملہ میں قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ سیاسی اقتدار اللہ کا ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے سیاسی اقتدار دیتا ہے (آل عمران ۲۶) مزید یہ کہ سیاسی اقتدار امتحان کا ایک پرچہ ہے جس طرح مال اور اولاد وغیرہ امتحان کے پرچے ہیں (یونس ۱۴)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی حکمرانی کے حصول کے لئے لڑائی کرنا اسلام کی تعلیم نہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فطری تاریخی حالات جس کے حق میں سیاسی اقتدار کا فیصلہ کریں، دوسرے لوگ اس کو قبول کر کے اس کو اپنے امتحان کا موقع دیں، نہ کہ لڑائی کر کے اس سے سیاسی امتحان کے خداداد پرچے کو چھیننے کی کوشش کریں۔

اسلام ایک نعمت

کیمسٹری کی سائنس اگر مفروضات پر بنے ہوئے قدیم فن کیمیا کو اپنے ساتھ شامل رکھتی تو کیمسٹری کی سائنس کبھی ترقی نہیں کرتی۔ اسی طرح ایسٹرانمی، اگر اوہام پر قائم قدیم علمی نجوم پر بھروسہ کرتی تو جدید ایسٹرانمی کا ارتقاء ممکن نہ ہوتا۔ یہی معاملہ تمام علوم کا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف علوم کی ترقی صرف اس وقت ممکن ہوئی ہے جبکہ ہر علم سے غیر سائنسی مفروضات کو الگ کر دیا گیا۔ اور خالص سائنسی حقائق کی بنیاد پر تمام علوم کو مدون کیا گیا۔ یہی اصول ہمیں مذہب کے بارے میں اختیار کرنا ہے۔

مذہب میں سائنسی مطالعہ کے ذریعہ ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ کون سا مذہب غیر متغیر حالت میں آج بھی موجود ہے۔ اور کون سے وہ مذاہب ہیں جو تغیرات کی بنا پر اپنا علمی استناد (authenticity) کھو چکے ہیں۔ اس اعتبار سے جب خالص علمی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیثیت اب صرف اسلام کو حاصل ہے۔ اسلام کا متن، اس کی تاریخ، اس کی تعلیمات حتی کہ اس کے متن کی اصل زبان بھی آج تک پوری طرح اپنی ابتدائی حالت میں موجود ہے۔ اسلام ہمیں قابلِ یقین مذہبی نظام بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسری وہ تمام چیزیں بھی جن کی ہمیں اپنی مذہبی زندگی کی تشکیل کے لئے ضرورت ہے۔

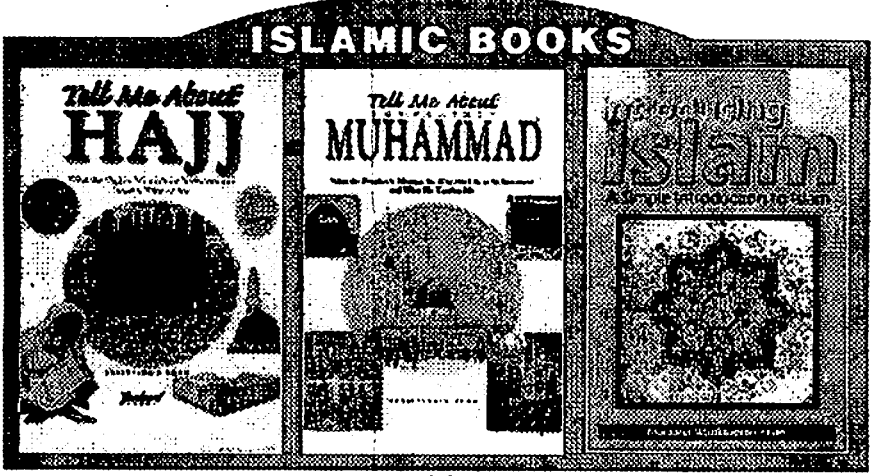

اتحاد کا فارمولا

نومبر۔دسمبر ۱۹۹۹ میں امریکہ کے لئے میرا دسواں سفر ہوا۔ موجودہ زمانہ میں امریکہ کو مادی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ اس کا راز میں نے یہ جانا کہ امریکہ کے لوگ کٹر ذہن کے نہیں ہیں۔ وہ تجربہ سامنے آنے کے بعد فوراً اس کے مطابق اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں یونی کلچرل ازم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یعنی یہ کوشش کی گئی کہ امریکہ کے تمام لوگ ایک ہی کلچر کو اختیار کر لیں۔ اس تحریک کو امریکنائزیشن کا نام دیا گیا۔ مگر متنوع کلچر کے امریکی سماج میں اس نظریہ کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اب امریکیوں نے اس کے جبری نفاذ کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ یونی کلچرل ازم کے نظریہ کو چھوڑ کر ملٹی کلچرل ازم کے نظریہ کو اختیار کر لیا۔

اب امریکہ میں ہر کلچرل گروپ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ انھیں باقاعدہ تعاون دیا جاتا ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنے اپنے کلچرل روٹ پر قائم رہو۔ کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسٹیبلائزڈ سوسائٹی (stabilized society) اسی طرح بن سکتی ہے۔ جس سماج کے افراد اپنی ثقافتی جڑوں سے اکھڑ جائیں، وہ اکھڑے ہوئے پیڑ کی مانند ہیں۔ ایسے لوگ نہ اپنے کام کے ہوں گے اور نہ دوسروں کے کام کے۔ کلچرل نیشنلزم یا یونی کلچرل ازم ایک قسم کا نظریاتی جنون ہے۔ ایسا نظریہ تخریب کاری میں تو مددگار ہو سکتا ہے مگر وہ کسی قوم کی تعمیر کاری نہیں کر سکتا۔

اس کے پیچھے زبردست حکمت ہے۔ کسی قوم کا کلچر ہمیشہ تاریخی عمل کے دوران تدریجی طور پر بنتا ہے۔ کلچر کوئی نافذ کرنے کی چیز نہیں۔ کسی خود ساختہ کلچر کو جبری طور پر نافذ کرنا سوسائٹی کو ڈی اسٹبلائز کرنے کے ہم معنی ہے۔ جس کا نتیجہ ہمیشہ سماجی انتشار ہوتا ہے۔

ہندستان میں کلچر کے معاملہ میں صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے کہا کہ "رام رحیم ایک ہے"۔ مگر یہ ایک خلاف واقعہ بات تھی اس لئے وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ خود مہاتما

گاندھی بھی اس کو اختیار نہ کر سکے۔ ۱۹۴۸ میں جب ان کو گولی لگی تو انھوں نے "ہے رام ہے رحیم" نہیں کہا بلکہ اس وقت ان کی زبان سے جو لفظ نکلا وہ صرف یہ تھا: "ہے رام"۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا نظریہ جو ہندستان میں ابھرا وہ ہندتو کا نظریہ تھا جس کو کلچرل نیشنلزم کہا جاتا ہے۔ یعنی سب کو ایک مفروضہ بھارتی کلچر کا پابند بنانا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو رامائزیشن آف رحمان کہا جا سکتا ہے۔ یہ دوسرا نظریہ نا قابل عمل ہونے کے ساتھ کٹر پن یا فنا ٹسزم کا عنصر بھی اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ عقل اور فطرت دونوں کے خلاف تھا اس بنا پر وہ نہ چلا اور نہ کبھی چل سکتا۔ صحیح اور فطری بات یہ ہے کہ کلچرل اختلاف کے معاملہ میں لکم دینکم ولی دین کا طریقہ اختیار کیا جائے، یعنی وہی طریقہ جس کو انگریزی میں کہا جاتا ہے: Let us agree to disagree.

کلچر اپنی فطرت ہی میں متنوع چیز ہے۔ کلچر کے معاملہ میں صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہر ایک کو آزادی دی جائے، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی آزادی کو جارحیت کی حد تک نہ لے جائے۔ گاندھی اور ان جیسے لوگوں کا نظریہ اس اصول پر مبنی ہے کہ تم مجھ کو سچا مانو میں تم کو سچا مانوں گا۔ اس کے مقابلہ میں ہندتو کا نظریہ گویا تنوع کو بلڈوز کر کے صرف ایک کو قائم کرنے کا نام ہے۔ مگر یہ دونوں ہی نا قابل عمل ہیں۔ اس معاملہ میں صحیح فارمولا یہ ہے کہ ہر ایک اپنی پسند کے طریقہ پر چلے، اور دوسرا طریقہ اپنانے والوں کے ساتھ احترام کا معاملہ کیا جائے۔

انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرق و اختلاف انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوں۔ بالفرض اگر ہم مذہبی فرق کو ختم کر دیں تب بھی ہزاروں معاملات ایسے باقی رہیں گے جن میں لوگوں کے درمیان فرق و اختلاف موجود ہوگا۔ ایسی حالت میں اصل ضرورت یہ ہے کہ مجموعی انسانی زندگی کے لئے اتحاد کا فارمولا دریافت کیا جائے نہ کہ صرف مذہبی شعبہ کے لئے۔ اور یہ فارمولا صرف ایک ہے۔ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کرنا اور باہم مل جل کر رہنا۔

سوال

ہم لوگوں نے ہندو مسلم میل ملاپ کا ایک منچ بنایا ہے۔ اس کے بارے میں ہم کو مارگ درشن کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سب مذہب ایک ہیں۔ جیسے رام ویسے محمد۔ یہ بات دونوں مان لیں تو آپس میں اپنے آپ میل ملاپ ہو جائے گا۔ (بلراج ملک اور وجے آنند ہمانی پت)

جواب

ہندو مسلم میل ملاپ کا مقصد بہت اچھا ہے۔ مگر "سب مذہب ایک ہیں" کے نظریہ سے یہ مقصد حاصل ہونے والا نہیں۔ اس لئے کہ یہ بات اصل واقعہ کے خلاف ہے۔ مثلاً ہندو عقیدہ کے مطابق۔ رام خدا کے اوتار تھے، یعنی ان کی صورت میں خود خدا مجسم ہو کر آیا۔ مسلمان اوتارواد کے اس عقیدہ کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک محمد ﷺ ایک انسان تھے جن پر خدا نے اپنی وحی بھیجی۔ ایسی حالت میں دونوں کو ایک کہنے سے جس چیز کو فروغ ہو گا وہ منافقت (hypocrisy) ہے نہ کہ فرقہ وارانہ میل ملاپ۔

ہندو مسلم میل ملاپ کا منچ بنانے کے لئے مفید طریقہ یہ ہے کہ اس کو سیکولر پیٹرن پر بنایا جائے نہ کہ کسی مذہبی پیٹرن پر۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کانگریس کے لوگ جو اسٹیج بناتے تھے اس پر ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی کافی تعداد میں آتے تھے۔ مگر آج ہندو تو کو ماننے والے جو اسٹیج بناتے ہیں اس پر زیادہ تر صرف ایک فرقہ کے لوگ آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہندو تو والا اسٹیج بناتے ہیں وہ وہاں سرسوتی دیوی کی وندنا کرتے ہیں اور کھڑے ہو کر بندے ماترم گاتے ہیں۔ مسلمان چونکہ ان چیزوں سے بھڑکتے ہیں اس لئے وہ ایسے اسٹیج پر اکٹھا نہیں ہوتے۔ جب کہ کانگریس کے اسٹیج پر اس قسم کی مذہبی رسمیں نہیں تھیں بلکہ وہ بالکل سیکولر انداز میں ہوتا تھا۔ اس لئے وہاں ہندوؤں کے ساتھ مسلمان بھی یکساں طور پر شریک ہوتے تھے۔

اگر آپ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک منچ بنانا چاہتے ہیں تو آپ کو ایسی چیزوں سے بچنا ہو گا جو دونوں کے لئے حساس اشو (sensitive issue) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً اگر آپ اپنے

منچ پر یہ کہیں کہ اجودھیا کے موجودہ عارضی مندر کو ڈھا کر وہاں دوبارہ بابری مسجد بنائی جائے تو ایسے منچ پر مسلمان تو آسکتا ہے مگر وہاں ہندو نہیں آئے گا۔ اسی طرح اگر آپ اپنے منچ پر یہ کہیں کہ جانوروں کا ذبیحہ بالکل ختم کر دیا جائے تو ایسے منچ پر ہندو آسکتے ہیں مگر وہاں مسلمان نہیں آئے گا۔ اس لئے آپ کو دونوں فرقوں کے میل ملاپ کا منچ بنانا ہے تو آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ اس قسم کے حساس اشو کو نظر انداز کریں اور صرف ان باتوں کو لیں جو دونوں کے درمیان مشترک ہیں۔ مثلاً امن، باہمی محبت، سوشل جسٹس، تعلیم، ملک کی مادی تعمیر، سماج سدھار وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالت میں ہندستان کے لئے وہی نمونہ قابل عمل ہے جو یورپ اور امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس معاملہ کا ایک عملی فارمولا دریافت کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ پرائیویٹ دائرہ میں ہر آدمی کے لئے مذہب کی مکمل آزادی اور اجتماعی دائرہ میں مشترک مفاد والی باتوں پر زور دینا۔ موجودہ حالات میں ہم کو بھی یہی کرنا چاہئے۔ میرے نزدیک فرقہ وارانہ میل ملاپ یا مذہبی ہم آہنگی کا بہترین قابل عمل فارمولا یہ ہے کہ ایک پر عمل کرو اور سب کا احترام کرو:

Follow one, respect all

برصغیر ہند کے تقریباً ۱۵ ملین ہندو اور مسلمان امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہاں دونوں کے درمیان کوئی مذہبی جھگڑا نہیں۔ دونوں نے بڑی تعداد میں مسجد اور مندر بنائے ہیں اور ہر فرقہ اپنے اپنے انداز پر اپنے مذہبی فرائض کو ادا کرتا ہے۔ پھر اگر امریکہ میں ہندو اور مسلمان مذہبی یکسانیت کے فارمولا کے بغیر اتحاد کے ساتھ رہ سکتے ہیں تو یہی چیز ہندستان میں کیوں ممکن نہیں۔

سوال

سلمان رشدی کی کتاب شیطانی آیات (The Satanic Verses) کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں۔ اور اس کا مصنف ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہے جس کی سزا سخت ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔ (نکہت کاظمی، نئی دہلی)

جواب

اسلام کی تعلیمات حقیقت پسندی پر مبنی ہیں۔ اس طرح کے معاملات کو اسلام میں جذباتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ رزلٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم باطل معبودوں کو برا نہ کہو ورنہ لوگ جہالت کی بنا پر خدا کو برا کہنے لگیں گے (الانعام ۱۰۸) یہی وجہ ہے کہ قدیم مدینہ کے سب سے بڑے گستاخ عبداللہ بن ابی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے طاقت کے باوجود قتل نہیں کرایا۔ اس کی وجہ آپ نے یہ بتائی کہ اگر میں ایسا کروں تو وہ اسلام کی بدنامی کا باعث ہوگا۔ چنانچہ عبداللہ بن ابی اپنی طبعی موت مرا اور اس کو قتل نہیں کیا گیا، حالانکہ اس وقت عبداللہ بن ابی کو قتل کرنا بالکل آسان تھا۔

سلمان رشدی کے خلاف قتل کا فتویٰ ۱۷ فروری ۱۹۸۹ کو دیا گیا تھا۔ اس واقعہ کو اب تقریباً ۱۲ سال ہو رہے ہیں۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس فتویٰ نے صرف الٹا نتیجہ پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد ساری دنیا میں بڑے پیمانہ پر اسلام کی بدنامی ہوئی۔ اسلام کو نفرت اور تشدد کے مذہب کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا۔ اس کتاب کے خلاف فتویٰ اور شور وغل سے اس کے مصنف کو تو زبردست فائدہ حاصل ہوا، جب کہ اسلام اور مسلمانوں کے حصہ میں صرف اس کا نقصان آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ میڈیا کا دور تھا۔ اور جدید میڈیا کے دور میں یقیناً وہی ہونے والا تھا جو عملاً پیش آیا۔

سلمان رشدی کی مذکورہ کتاب میں نے پڑھی ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب تصنیفی اعتبار سے اس قدر لغو اور غیر دلچسپ ہے کہ شاید کوئی بھی شخص اس کو شروع کر کے ختم نہیں کر سکتا۔ عام حالت میں وہ ایک ایسی کتاب تھی جو اپنی لغویت کی بنا پر اپنے آپ مر جاتی۔ اس کو نہ کوئی خریدتا اور نہ اس کو کوئی پڑھتا۔ مگر مصنف کے قتل کے فتویٰ کی بعد جب میڈیا میں اس کا چرچا ہوا تو فطری طور پر لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس طرح ایک ناقابل مارکیٹ کتاب بھی قابل مارکیٹ (marketable) کتاب بن گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس فتنہ کا صحیح ترین حل یہ تھا کہ اس کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا جاتا

اور اس طرح یقینی طور پر وہ اپنے آپ مر جاتی۔ اس طرح کے مسئلہ کا صحیح ترین حل وہ ہے جو اسلام کے خلیفۂ ثانی عمر فاروق کے ایک قول میں ملتا ہے۔ انھوں نے کہا: امیتوا الباطل بالصمت عنہ. یعنی باطل کو ہلاک کرو اس پر چپ رہ کر:

Kill the falsehood by observing silence over it.

سوال

آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ سارے لوگ آپ کی بولی بول رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کے مخالفین بھی آپ کا نام لئے بغیر آپ کی باتوں کو دہرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ میثاق (اپریل ۲۰۰۰) میں پاکستان کی تنظیم اسلامی کے امیر کا مفصل خطاب چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے صلح حدیبیہ کی پالیسی کی حمایت کی ہے اور یہ کہا ہے کہ "بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ کے طرز کی مفاہمت" ہمارے مسئلہ کا حل ہے۔ حالانکہ یہ صاحب پہلے آپ کے مخالف تھے اور جوش و خروش کے ساتھ مسلح جدو جہد (armed struggle) کی بات کیا کرتے تھے۔ یہی بات دوسرے اکثر لکھنے اور بولنے والوں میں دیکھی جا رہی ہے۔ اس طرح آپ کے اعتراف کے بغیر تقریباً تمام لوگوں نے آپ کے نقطۂ نظر کو مان لیا ہے۔ اس پر آپ کا تبصرہ کیا ہے (عبدالرحمٰن، نئی دہلی)

جواب

یہ بات عملی طور پر اطمینان بخش ہے کہ مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگ اب عام طور پر حقیقت پسندی کا راستہ اختیار کر رہے ہیں۔ مگر میرے لئے اس میں بہت زیادہ خوشی کی بات نہیں۔ میں حدیبیہ کی وکالت بطور ایک اصول کرتا رہا ہوں۔ مگر یہ حضرات اس کو ایک مجبورانہ عمل کے طور پر اختیار کر رہے ہیں۔ مثلاً ماہنامہ میثاق کے مذکورہ خطاب میں حدیبیہ پالیسی کی وکالت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پاکستان کو بھارت کے ساتھ صلح حدیبیہ کی طرز کی مفاہمت کرنی چاہئے (۲۵) پاکستان جس مسئلہ سے دوچار ہے اس کا علاج صلح حدیبیہ ہے (۱۵) پاکستان کے لئے جنگ جیتنا ممکن نہیں کیوں کہ پاکستان سے کہیں زیادہ ایٹم بم بھارت کے پاس موجود ہیں (۲۲)۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں جو کچھ کہتا ہوں، بطور اصول کہتا ہوں نہ کہ بطور مجبوری۔ صبر میرے نزدیک ایک اعلیٰ اصول ہے نہ کہ مجبورانہ روش۔ اسی طرح صلح حدیبیہ میرے نزدیک ایک اعلیٰ اسلامی اصول ہے، وہ کوئی مجبورانہ پالیسی نہیں۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ جب مجبوری کی فضا نہ ہو تو مسلح تصادم کی باتیں کی جائے، اور جب مجبوری کی حالت پیش آجائے تو صلح حدیبیہ کا وعظ شروع کر دیا جائے۔ صلح حدیبیہ میرے نزدیک دعوتی عمل کو موثر طور پر جاری رکھنے کی ایک حکیمانہ تدبیر ہے۔ نہ کہ کسی قسم کی مجبورانہ روش۔

سوال

میں آپ کے الرسالہ کا خریدار ہوں۔ ایک حدیث کی وضاحت چاہتا ہوں۔ حدیث یہ ہے: اذان کے وقت کی دعا قبول ہوتی ہے۔ کیا مطلب ہے۔ کیا باقی اوقات میں اللہ تعالیٰ دعا قبول نہیں کرتا۔ یہ حدیث صحیح ہے یا غلط ہے یا مشکوک ہے۔ معلوم کریں۔ (محمد موسیٰ، مانوی، Pin-584123)

جواب

آپ نے جس حدیث کا ذکر کیا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں: ان الدعاء لا یرد بین الاذان والاقامة فادعوا (مسند احمد، الترمذی، کتاب الصلاۃ) یعنی اذان اور اقامت کے درمیان کی دعا رد نہیں ہوتی، پس تم اس وقت اللہ سے دعا کرو۔ اس حدیث میں جو بات وقت کے حوالہ سے کہی گئی ہے وہ دراصل کیفیت کے حوالہ سے مقصود ہے۔ اذان کو سن کر مومن کے اندر یاد خدا کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ اس بنا پر اس وقت کی دعا میں وہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو قبولیت کی علامت ہے۔

اس حدیث کا خطاب اس مومن سے ہے جس نے مسجد سے اذان کی آواز سنی اور پھر اس کے دل میں وہ ربانی جذبات پیدا ہونے لگے جن کا اعلان اس وقت موذن کر رہا تھا۔ وہ اللہ کی کبریائی اور اس کی عظمت کے احساسات سے بھرا ہوا مسجد میں آیا۔ یہاں اس نے وضو کر کے اپنے کو پاک کیا، یہاں تک کہ اس کی زبان سے نکلا: رب اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطهرین۔

اس کے بعد وہ مسجد کے خدا پرستانہ ماحول میں داخل ہوا اور سنت کی رکعتیں ادا کر کے اللہ کی یاد کو اپنے دل میں تازہ کیا۔ اس طرح اذان اور اقامت کے درمیان وہ ایک ایسا انسان بن گیا جو ایمانی جذبات سے سرشار تھا اور نفسیاتی اعتبار سے اس قابل بن چکا تھا کہ اس کی زبان سے ایسے پاکیزہ کلمات نکلیں جو سیدھے اللہ تک پہنچ جائیں۔ یہی وہ انسان ہے نہ کہ وقت جس کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ اے بندے خدا سے دعا کر، کیوں کہ اس وقت تو جس حال میں ہے اس حال میں کی ہوئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔

یہاں دعا کا مطلب دعا کے الفاظ منھ سے بول دینا نہیں ہے بلکہ دعا کا حقیقی عمل کرنا ہے۔ دعا کا عمل یہ ہے کہ آدمی جذبۂ احتیاج کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ ایک طرف اپنے عجز اور دوسری طرف خدا کی قدرت کو یاد کر کے وہ اس کو پکارے۔ جب ایک بندہ اس عملِ دعا کے لئے بیٹھے تو اذان اور اقامت کے درمیان کا وقت اس عمل کے لئے اسی طرح انتہائی معاون ثابت ہوگا جس طرح گرمی کا موسم لکڑی میں آگ لگانے کے لئے معاون ہوتا ہے۔ جس طرح گرمی کے ماحول میں جلانے کا عمل کیا جائے تو لکڑی فوراً آگ پکڑ لیتی ہے اسی طرح جب اذان اور اقامت کے درمیان پر اثر ماحول میں ایک شخص دعا کا عمل کرے تو اس کے اندر وہ کیفیات امنڈ پڑتی ہیں جو اس کی دعا کو حقیقی معنوں میں بندے کی پکار بنا دیں۔ جو اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو وہ ربانی الفاظ بنا دیں جس کے بعد دعا کی قبولیت کا معاملہ ٹھیک ویسا ہی بن جاتا ہے جیسے گرمی کے موسم میں لکڑی کو جلانا۔ سخت گرمی کے موسم میں دیا سلائی جلاتے ہی لکڑی آگ کو پکڑ لے گی اسی طرح اذان اور اقامت کی درمیان پر اثر فضا تیار ہو جاتی ہے جب کہ بندہ کی زبان سے حقیقی دعا نکلے اور اس کا رب اس کو فوراً قبول کر لے۔

سوال

آپ نے الرسالہ مئی ۲۰۰۰ میں لکھا ہے کہ الجزائر کے اسلام پسندوں کو بندوق اٹھانے کے بجائے اسلامی دعوت کا کام کرنا چاہئے۔ گویا کہ آپ اسلام کو سیاست سے دور رکھنے کا مشورہ

دے رہے ہیں۔ حالانکہ اسلامی شاعر کے بقول: جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔
(م۔ا۔ معراج، ناندیڑ)

جواب

مسئلہ دین کو سیاست سے جدا کرنے کا نہیں ہے بلکہ دین کو چنگیزی سے جدا کرنے کا ہے۔ دین کے نام پر سیاست چلانا بجائے خود چنگیزی کی بدترین قسم ہے۔ کیوں کہ اس قسم کی سیاست سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ دین نہیں ہے بلکہ سیاسی ہنگامہ آرائی، تشدد اور باہمی جنگ و جدال ہے۔ جس کا نمونہ آج ہر اس جگہ نظر آتا ہے جہاں نام نہاد اسلام پسند اسلام کے نام پر اپنی سیاست چلا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دین جب جدا ہوتا ہے تو سیاست سے جدا نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان سے جدا ہوتا ہے۔ انسان کے دل سے جب اللہ کا خوف نکل جاتا ہے تو اس کی سیاست اور غیر سیاست سب چنگیزی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو انسان اللہ کی پکڑ کا اندیشہ رکھتا ہو اس کی سیاست بھی رحمت ہوگی اور اس کی غیر سیاست بھی رحمت۔

سوال

آپ کے خیال میں علم و فکر کی فوقیت عمل پر ہے جیسا کہ عام خیال ہے کہ عمل پہلے ہے اور فکر بعد میں۔ اسلام کی روشنی میں واضح فرمائیں۔ (طارق اشفاق، علیگڑھ)

جواب

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کامن سنس ہی اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ کوئی بھی آدمی جو کوئی بڑا عمل کرتا ہے، اس کے عمل کا آغاز فکر کی دنیا سے ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر فکر کی سطح پر ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ خارجی عمل کی صورت اختیار کرتی ہے۔ یہی معاملہ ایمان و عمل کا بھی ہے۔ اسلام میں بھی خارجی عمل کا اصل سرچشمہ داخلی ایمان ہے۔ کسی آدمی کے اندر جتنا گہرا ایمانی شعور پیدا ہوگا، خارجی دنیا میں اتنا ہی زیادہ اس سے عمل کا اظہار ہوگا۔

۱ اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن، سہارنپور کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے سہارنپور کا سفر کیا۔ وہاں انھوں نے ۱۰ اپریل ۲۰۰۰ کو ایک عمومی جلسہ میں خطاب کیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاء اللہ الرسالہ میں سفر نامہ کے تحت شائع کی جائے گی۔

۲ نئی دہلی کے ہندی اخبار ویر ارجن نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ویر ارجن کے شمارہ ۱۱ر اپریل ۲۰۰۰ میں چھپا ہے۔ اس انٹرویو میں تفصیل کے ساتھ ملکی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے: مولانا وحید الدین خاں کا کہنا ہے کہ دیش میں اشکشت لوگوں کی سنکھیا ادھک ہونے کے کارن ہم اس تیزی سے وکاس نہیں کر پا رہے ہیں جس تیزی سے ہمارے ساتھ آزاد ہونے والے دوسرے دیش کر رہے ہیں۔ مولانا کا کہنا ہے کہ میں مہاتما گاندھی کے اس وچار سے سہمت نہیں ہوں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ میرے دیش کے لوگ اشکشت ضرور ہیں مگر وہ اگیانی نہیں۔ (صفحہ ۴)

۳ دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ نے ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر شیطانک ورسز اور اس کے مصنف سلمان رشدی سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ کتاب ہمارے نزدیک بھی اتنی ہی غلط ہے جتنا کہ دوسرے لوگ اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کا حل تشدد نہیں ہے بلکہ علمی تردید ہے۔ میڈیا کے زمانہ میں اس طرح کے معاملات میں تشدد کا نتیجہ ہمیشہ الٹا (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔ یہ انٹرویو ٹائمس آف انڈیا کے شمارہ ۲۰ اپریل ۲۰۰۰ میں اس کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔

۴ ایک مشترک سمیلن میں شرکت کے لئے صدر اسلامی مرکز نے پانی پت اور کرنال کا سفر کیا۔ یہ سفر ۷ مئی ۲۰۰۰ کو ہوا۔ اس سفر کے تجربات اور خطابات انشاء اللہ سفر نامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دئے جائیں گے۔

۵ بی بی سی لندن (ہندی سروس) نے ۸ مئی ۲۰۰۰ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر میڈیا کے بارے میں تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ موجودہ میڈیا کا مزاج یہ ہے کہ وہ سلیکٹیو رپورٹنگ کرتا ہے۔ وہ ہاٹ نیوز کو لیتا ہے اور سافٹ نیوز کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس بنا پر جو لوگ میڈیا پر انحصار کرتے ہیں وہ دنیا کے بارے میں حقیقی تصویر نہیں بنا پاتے۔

۶ مطالعۂ قرآن، مطالعۂ حدیث، مطالعہ سیرت کے نام سے تین کتابوں کے سٹ جو منصوبہ ہے ان میں سے مطالعۂ قرآن اللہ کے فضل سے لکھی جا چکی ہے اور اب زیر طبع ہے۔ مطالعۂ حدیث اس وقت زیر ترتیب ہے۔ مطالعۂ سیرت تیار ہو کر چھپ چکی ہے۔

۷ جامعہ ماس کمیونی کیشن سنٹر (نئی دہلی) کے اسٹوڈیو نے صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو ۱۶ مئی ۲۰۰۰ کو ریکارڈ کیا۔ اس کا موضوع تھا: عورت اسلام میں۔ اس میں موضوع سے متعلق سوالات کے جواب دئے گئے۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ عورتیں اگر مردوں کی طرح طلاق کا ذاتی حق حاصل کرنا چاہیں تو اس کا شرعی حل نکاح تفویض کی صورت میں موجود ہے۔ وہ نکاح تفویض کے ذریعہ یہ حق حاصل کر سکتی ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا گیا کہ تعدد ازدواج کا حکم اس وقت کے لئے ہے جب کہ عورتیں مرد کے مقابلہ میں سرپلس ہو گئی ہوں۔ مثال کے طور پر دوسری عالمی جنگ کے بعد جرمنی میں مردوں کی تعداد کم ہو گئی اور عورتیں بہت زیادہ ہو گئیں۔ چنانچہ عورتوں نے اپنے دروازہ پر یہ بورڈ لگا لیا کہ رات گزارنے کے لئے ایک مہمان چاہئے:

Wanted an evening guest

گویا ایسی صورت حال میں انتخاب مونوگیمی اور پولوگیمی کے درمیان نہیں ہے بلکہ مونوگیمی اور سیکشول انارکی کے درمیان ہے۔ ایسی صورت حال میں جدید تہذیب سیکشول انارکی کا چائس لیتی ہے جبکہ اسلام نے پولوگیمی کا چوائس لیا ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ دونوں میں سے کون سا چوائس زیادہ بہتر ہے۔

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے	بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

ISLAMIC BOOKS

Tell Me About Hajj *(with colour pictures)*	295/-
Tell Me About the Prophet Muhammad *(with colour pictures)*	345/-
Allah is Known Through Reason *(with colour pictures)*	345/-
The Miracle in the Ants *(with colour pictures)*	295/-
The Quran	295/-
The Quran: An Abiding Wonder	145/-
The Call of the Qur'an	95/-
The Koran	195/-
Heart of the Koran	195/-
The Soul of the Quran	145/-
Presenting the Quran	125/-
The Moral Values of the Quran	125/-
The Basic Concepts in the Quran	195/-
A Treasury of the Quran	75/-
The Quran for all Humanity	75/-
The Beautiful Commands of Allah	125/-
The Beautiful Promises of Allah	175/-
The Wonderful Universe of Allah	85/-
Muhammad: A Prophet for all Humanity	195/-
Muhammad: A Mercy to all the Nations	250/-
Words of the Prophet Muhammad	75/-
The Sayings of Muhammad	75/-
The Life of the Prophet Muhammad	75/-
Muhammad: The Hero as Prophet	75/-
History of the Prophet Muhammad	75/-
An Islamic Treasury of Virtues	195/-
A-Z Steps to Leadership	95/-
Islam and Peace	150/-
Introducing Islam	195/-
The Moral Vision	145/-
Principles of Islam	145/-
The Muslim Prayer Encyclopaedia	295/-
After Death, Life!	195/-
Living Islam: Treading the Path of Ideal	250/-
A Basic Dictionary of Islam	250/-
The Muslim Marriage Guide	250/-
The Essential Arabic	175/-
Indian Muslims	65/-
God Arises	125/-
Islam: The Voice of Human Nature	40/-
Islam: Creator of the Modern Age	70/-
Woman Between Islam and Western Society	145/-
Woman in Islamic Shari'ah	125/-
Islam As It Is	70/-
Religion And Science	45/-
Man Know Thyself	8/-
Muhammad: The Ideal Character	8/-
Tabligh Movement	40/-
Polygamy and Islam	7/-
Hijab in Islam	20/-
Concerning Divorce	7/-
The Way to Find God	25/-
The Teachings of Islam	50/-
The Good Life	45/-
The Garden of Paradise	45/-
The Fire of Hell	45/-
Islam and the Modern Man	25/-
Uniform Civil Code	10/-

Goodword
B·O·O·K·S
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013
Tel. 462 6666, 462 5454, 4611128
Fax: 469 7333, 464 7980 email: skhan@vsnl.com

Goodword B·O·O·K·S

Just Released!

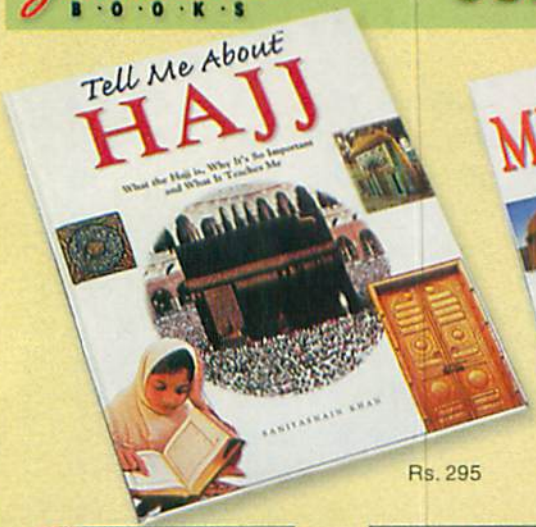

Rs. 295

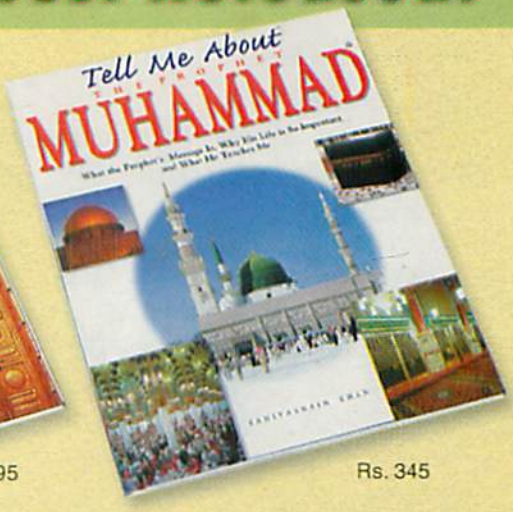

Rs. 345

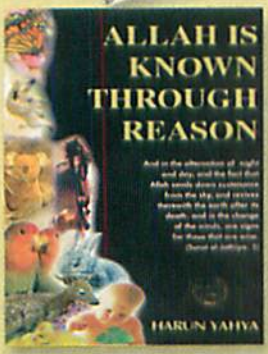

Rs. 295

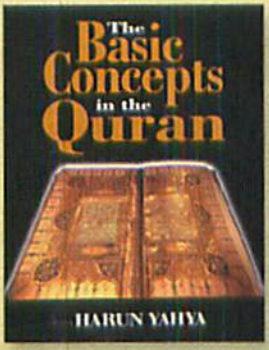

Rs. 195

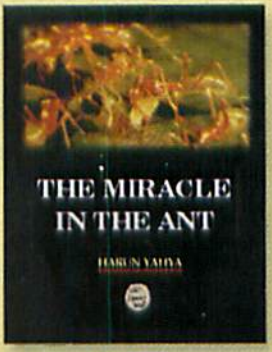

Rs. 295

Forthcoming Publications

- **Islam Rediscovered** by Maulana Wahiduddin Khan
- **The Revival of Islam** by Maulana Wahiduddin Khan
- **GCSE Islam–The Do-It-Yourself Guide** by Ruqaiyyah Waris Maqsood
- **The Beloved Prophet** by Ruqaiyyah Waris Maqsood
- **Hadith for Biginners** by Dr. Muhammad Zabayr Siddiqui
- **A Short Biography of the Prophet Muhammad** by Dr. Muhammad Hamidullah
- **An Introduction to Islam** by Dr. Muhammad Hamidullah
- **A Simple Guide to Muslim Prayers** by Muhammad Mahmud Al-Sawwat
- **A Handbook of Muslim Belief** by Dr. Ahmad A Galwash
- **Ever Thought About the Truth?** by Harun Yahya
- **Crude Understanding of Disbelief** by Harun Yahya
- **One Religion** by Zaheer U. Ahmed
- **Tell Me About Moses and Pharaoh** by Saniyasnain Khan

GOODWORD PRESS

1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013

Tel. 462 5454, 4611128 , 462 6666 Fax: 469 7333, 464 7980 email: skhan@vsnl.com

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2000 Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2000